www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ
Al-Risala

May-June 2025 • Rs. 50

حضرت ابراہیم کی زندگی کا سبق — خدا کی اس دنیا میں کوئی ”غروب“ آخری نہیں۔ ہر غروب کے لیے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الرسالہ

May-June 2025 | Volume 50 | Issue 3

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

عیدِ اضحیٰ کا سبق 4
پیس فل ایکٹوزم، وائلنٹ ایکٹوزم 5
قرآن کی چند آیتیں 6
موت کا سبق 9
میدان کا انتخاب 10
حاصلِ تجربہ 14
خدا کو پانا 15
اِن شاء اللہ 17
اسلامی سرگرمی 18
خدا کی رحمت 19
اتحاد کی نفسیات 23
جہنم کی طرف 24
یک طرفہ رپورٹنگ 25
ہائی پروفائل، لو پروفائل 26
ایک دَور کا مشاہدہ 27
حق گوئی و بے باکی 28
ہجرتِ رسول 29
کامیابی کا درست طریقہ 30
ضمیر یعنی سینسر 31
جمعہ کا دن 33
جدید انسان کی تلاش 35
ذکر اللہ 37
ایک انٹرویو 38
ڈائری 1986 42
ایک سوال 48
خبرنامہ اسلامی مرکز 49

शुक्र की अहमियत 1
हर चीज़ एक इम्तिहान का पेपर है 2
विनम्रता — एक महान इबादत 3
जीवन का कला कौशल 4
सफलता का रहस्य 5
आत्महत्या: सबसे बड़ा पागलपन 6
वापसी संभव नहीं होगी 7
सोहबत का असर 8
एक कठिनाई, दो आसानियाँ 9
अक़्लमंद इंसान 11
मिलती—जुलती दुनिया 12
मेहमान—नवाज़ी या दिखावा 13
सच्चा अमल, सच्ची दुआ 14
शादाबी लौट आई 15
क्रोध को त्याग दो 16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

عیدِ اضحیٰ کا سبق

عیدِ اضحیٰ کی قربانی کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ حضرت ابراہیم کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب ایک طریقہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو رہا ہو تو اپنے منصوبہ کی ری پلاننگ (re-planning) کرنی چاہیے۔ مثلاً پیغمبر ابراہیم نے اُر (موجودہ عراق) سے اپنے پیغام کا آغاز کیا۔ مگر جب وہاں ان کو کامیابی نہیں ملی، بلکہ آگ میں ڈال دیا گیا تو حضرت ابراہیم نے ایسا بالکل بھی نہیں کیا کہ اس کو ظلم کے خانے میں ڈال کر شکایت کا طریقہ اختیار کریں، بلکہ انھوں نے اپنے عمل کی ری پلاننگ کی، جس کا کلمینیشن (culmination) مکہ کی آبادی، اور پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کا وجود میں آنا تھا۔

عیدِ اضحیٰ دراصل اس بات کا سبق ہے کہ اپنے عمل کی ری پلاننگ کرو۔ کھوئے ہوئے کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو، خواہ اس کے لیے قربانی کی سطح پر عمل کرنا پڑے۔ کھوئے ہوئے کو دوبارہ اسی نہج پر پانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ کوشش میں ناکامی کے بعد حالات کا دوبارہ مطالعہ کر کے اپنے عمل کی ری پلاننگ کرے۔

ری پلاننگ فطرت کا ایک عام اصول ہے۔ وہ ہر معاملے میں قابلِ انطباق ہے۔ خواہ وہ معاملہ مذہبی ہو یا سیکولر۔ انسان کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ جو طریقۂ کار مؤثر ثابت نہ ہو، اُسی کو بار بار آزماتا رہے۔ اس کے بجائے، اسے اپنے عمل کی ری پلاننگ کرنی چاہیے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔ درخت کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ اگر کسی شاخ کو بڑھنے سے کوئی چیز روکتی ہے تو وہ اپنا رخ بدل کر آگے بڑھنے لگتی ہے۔ ٹریفک کا بھی عام اصول یہی ہے کہ جب ڈرائیور دیکھتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے تو وہ راستہ بدل کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نتیجہ رُخی عمل کا موقع ختم ہو گیا تو اللہ تعالی نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ ساری دنیا میں اسلام کے لیے راستہ کھل گیا۔ اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ نے اشارہ کیا ہے: مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے، وہ تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اُس کو یثرب کہتے ہیں، لیکن وہ مدینہ ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1748)۔

پیس فل ایکٹوزم، وائلنٹ ایکٹوزم

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ، وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2593)۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: بیشک اللہ نرم ہے، اور نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرمی پر وہ سب عطا کرتا ہے، جو وہ سختی پر عطا نہیں کرتا، اور نہ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر عطا کرتا ہے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: وَيَرْضَاهُ، وَيُعِينُ عَلَيْهِ مَا لَا يُعِينُ عَلَى الْعُنْفِ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 852)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نرمی سے راضی ہوتا ہے، اور نرمی پر وہ جس طرح مدد کرتا ہے، ایسی مدد وہ سختی پر نہیں کرتا۔

یہ حدیث طریقِ کار کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ پر امن طریقِ کار پر آتی ہے۔ متشددانہ طریقِ کار پر اللہ کی مدد نہیں آتی ہے۔ مزید غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان پر امن انداز میں اپنا کام کرتا ہے، تو فطرت کے قوانین انسان کے موافق بن جاتے ہیں۔ انسان کو اپنے کام میں فرشتوں کی مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ مسلح طریقِ کار میں ایسا نہیں ہوتا۔ مسلح طریقہ ہمیشہ ری ایکشن پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس، پر امن طریقِ کار ری ایکشن کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند کرتا ہے، وہ سختی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نرمی یا پر امن طریقِ کار اختیار کرنے کی صورت میں مسئلہ حل ہوتا ہے۔ جب کہ تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کی صورت میں مسئلہ ہمیشہ بڑھ جاتا ہے۔ پیس فل طریقِ کار اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوئے بغیر مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کی صورت میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ البتہ نئے نئے مسائل پیدا ہو کر مقصد کے حصول کو اور زیادہ مشکل بنا دیتے ہیں۔

قرآن کی چند آیتیں

قرآن کی سورہ آل عمران کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

آسمانوں کی پیدائش میں اوررات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کی لیے بہت نشانیاں ہیں (لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ)۔ جوکھڑے اور بیٹھے اوراپنی کروٹوں پر (قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ اے ہمارے رب تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے۔ پس تو ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ)۔ اے ہمارے رب تونے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کردیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لائے (إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا)۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو تو ہم سے دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر (تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ)۔ اے ہمارے رب تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہم سے کیے ہیں، ان کو تو ہمارے ساتھ پورا کر (آتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ) اور قیامت کے دن تو ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت (أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى)۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو، پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں شامل ہو گئے اور لڑے اور مارے گئے (فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا)، میں ضرور ان کی خطائیں ان سے دور کردوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے۔ اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ (3:190-195)

قرآن کی یہ آیتیں فہم دین کے لیے بہت زیادہ اہم ہیں۔ ان آیتوں میں جن نکات (points) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کو یہاں مختصر طور پر نمبر وار درج کیا جارہا ہے:

1۔ ان آیات سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی معرفت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے، جو اپنی عقل (reason) کو استعمال کریں (لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ)۔ آیت میں اولوا الالباب کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ اصحاب عقل یعنی جو لوگ اپنی عقل کو استعمال کرکے زمین و آسمان کی چیزوں (creation) میں غور کریں۔ گویا کہ معرفت الٰہی کسی پراسرار طریقے سے حاصل نہیں ہوتی، معرفت کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے عقل کو استعمال کرکے تخلیقی مظاہر میں غور وفکر کرنا۔

2۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی انسان کو خدا کی معرفت (realization) حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کی پوری شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ ہر حال میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے (قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ)۔ انسان ایک فکری مخلوق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا حیوان (thinking animal) ہے۔ انسان کی سوچ ہی وہ عمل ہے، جو اس کی شخصیت کی تعمیر کرتی ہے۔ ربانی سوچ سے ربانی انسان بنتا ہے اور غیر ربانی سوچ سے غیر ربانی انسان۔

3۔ اس معرفت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور کائنات کی معنویت کو دریافت کرلیتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ خدا کے خالق ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہیے کہ آدمی خدا کے سامنے جواب دہ ہو (مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ)۔ تخلیق اور جواب دہی (accountability) دونوں اس کو ایک حقیقت کے دو حصے نظر آنے لگتے ہیں۔ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ لازماً ایک دن انسان کا محاسبہ کرے گا اور اس کے عمل کے مطابق، اس کے لیے جزا و سزا کا فیصلہ کرے گا۔

4۔ اس معرفت کے نتیجے میں انسان کے اندر جو شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا ضامن ہوتا ہے کہ وہ حق کے داعی کو پہچان لے (إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا)۔ حق کے داعی کو نہ پہچاننے کا واحد سبب یہ ہے کہ آدمی کنڈیشننگ کا شکار ہو۔ معرفت آدمی کو

اس قابل بناتی ہے کہ وہ کنڈیشننگ سے باہر آکر چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہیں۔ یہ صلاحیت آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ تعصّباتِ ذہنی سے آزاد ہو کر کسی انسان کو پہچان لے۔ اس طرح، حق کی معرفت آدمی کے لیے حق کے داعی کی معرفت کا یقینی ذریعہ بن جاتی ہے۔

5۔ جب ایک شخص کو معرفت والی زندگی حاصل ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا وہ حال ہوتا ہے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2956)۔ یعنی، دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس دنیا میں عارفِ حق کو غیر عارفین کے درمیان زندگی گزارنا پڑتا ہے۔ خدا پرست کو غیر خدا پرستوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ آخرت پسند انسان کو ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے جن کا کنسرن صرف دنیا ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کی بنا پر ایک سچے مومن کو دنیا ایک قید خانہ کے مانند نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی بہترین تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کو عارفینِ حق کے معاشرے میں رہنا نصیب ہو۔ اسی معاشرے کا نام جنت ہے۔ جب کسی شخص کو معرفت حاصل ہوتی ہے تو وہ عین اس کے فطری تقاضے کے مطابق، جنت کا طالب بن جاتا ہے۔ یہی مطلب ہے تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ کا، یعنی ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔

6۔ آتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ —— ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں پیغمبر کے سچے امتی بھی برابر کے شریک ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ بلا شبہ بہت بڑی بشارت ہے۔ تاہم خدا کی یہ عنایت صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے، جو کسی شرط کے بغیر پیغمبر کا اعتراف کریں اور کسی شرط کے بغیر اپنی عملی زندگی میں اس کی پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جس طرح پیغمبر کے معاصرین کے لیے ہے، اسی طرح اس سنت کا تعلق بعد کے دور کے اُن لوگوں سے بھی ہے جو پیغمبر کے مشن کو زندہ کرنے کے لیے اٹھیں، اور ساتھ دینے والے ان کا ساتھ دیں۔

7۔ اگلی آیت میں عامل کے عمل کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حتمی وعدہ ہے کہ وہ سچے عامل کے عمل کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ یہ سنت مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی (أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ

عامِلٍ مِنكُمۡ مِنۡ ذَكَرٍ أَوۡ أُنۡثٰی)۔اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ایک سچے مومن کے لیے بلاشبہ سب سے بڑا سہارا ہے۔حالات خواہ کتنے ہی سخت ہوں۔اگر وہ حقیقتاً اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے ابدی طور پر یہ بشارت ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَالَّذِينَ هُمۡ مُحۡسِنُونَ (16:128)۔یعنی، بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرنے والے ہیں۔

8۔اس کے بعد قرآن میں چند چیزوں کا ذکر ہے: ہجرت، وطن سے اخراج، اللہ کے راستے میں ستایا جانا اور قتال(فَالَّذِينَ هاجَرُوا وَأُخۡرِجُوا مِنۡ دِيارِهِمۡ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقاتَلُوا وَقُتِلُوا)۔یہ چاروں شرطیں لازماً لفظی طور پر مطلوب نہیں ہیں۔بلکہ وہ معنوی طور پر مطلوب ہیں۔یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہر زمانے میں شکل کے اعتبار سے عین ایسا ہی واقعہ پیش آئے گا کہ ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑے، وہ اپنے گھروں سے نکالے جائیں، ان کو جسمانی طور پر ستایا جائے، ان کو مسلح جنگ کرنا پڑے۔یہ سب شرطیں حقیقی نہیں ہیں، بلکہ وہ اضافی ہیں۔

قدیم قبائلی دور(tribal-age)میں یہ واقعات شکلاً پیش آئے،لیکن موجودہ زمانہ آزادی اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔اب انسانی حقوق(human rights)کو عالمی طور پر مان لیا گیا ہے۔اب بھی سچے اہل ایمان کے ساتھ یہ تجربات پیش آئیں گے،مگر وہ بہ اعتبارِ حقیقت(spirit)ہوں گے، نہ کہ باعتبارِ صورت۔

******

موت کا سبق

موت ہر انسان پر اچانک آتی ہے۔اس بنا پر انسان مجبور ہے کہ موت کے معاملے میں غیر یقینی حالت میں جیے۔یہ غیر یقینی حالت صرف موت کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہے۔انسان کو چاہیے کہ وہ فطرت کے اس قانون کو قبول کرے، اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی پلاننگ کرے۔ورنہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو ابدی نقصان سے بچا نہیں سکتا۔

میدان کا انتخاب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جب آدم اور حوا کو پیدا کیا تو ان کو جنت میں آباد کیا۔ اللہ نے فرمایا کہ تم پوری جنت کو استعمال کر سکتے ہو، لیکن جنت کا ایک درخت تمھارے لیے شجرِ ممنوع (forbidden tree) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے تم دونوں اس درخت کے پاس مت جانا اور اس کا پھل مت کھانا ورنہ تم دونوں ظالم ہوجاؤ گے:

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (2:35)۔

Do not approach this tree lest you become wrongdoers (2:35)

یہ قصہ صرف آدم اور حوا کا ایک قدیم روایتی قصہ نہیں، اس میں پوری انسانیت کے لیے ایک ابدی سبق موجود ہے۔ یہ قصہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کیا ہے اور یہ کہ اس تخلیقی منصوبے کے مطابق، ہر عورت اور ہر مرد کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ ان کو ناکامی سے بچنے کے لیے اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ آدم اور حوا نے اس ممنوع درخت کا پھل کھالیا۔ ان سے یہ غلطی صرف ایک درخت کے بارے میں ہوئی تھی، مگر عملی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پوری جنت سے محروم ہو گئے۔

آدم اور حوا کا یہ قصہ انسان کے بارے میں خالق کے مقرر کردہ ایک اہم اصول کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کے لیے ایک ”ممنوع درخت“ (forbidden tree) ہوتا ہے۔ فرد اور جماعت دونوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اس ”ممنوع درخت“ کو دریافت کریں اور اس سے کامل طور پر پرہیز کریں، ورنہ وہ لازمی طور پر اس کے برے انجام سے دوچار ہوں گے اور پھر کوئی چیز نہ ہوگی، جو ان کو اس تباہ کن انجام سے بچائے۔

اب اس معاملے کو فرد کی نسبت سے دیکھیے۔ اس دنیا کو بنانے والے نے ایک خاص مقصد کے تحت اسے بنایا ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا ایک انتخابی میدان (selection ground) ہے۔ اس دنیا میں مختلف قسم کے موافق اور ناموافق حالات کے درمیان آدمی کا امتحان لیا جارہا ہے۔ اس مقصد

کے تحت اس دنیا میں ہر عورت اور مرد کو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آتا ہے۔ آدمی اپنے مزاج کے اعتبار سے معیار پسند (idealist) ہے، مگر موجودہ دنیا میں ہر چیز غیر معیاری ہے۔ اس بنا پر عملاً یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی بے شعوری کی بنا پر منفی سوچ (negative thinking) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو جنت کے لیے غیر مستحق انسان بنا لیتا ہے۔

اس امتحان میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی یہ دریافت کرے کہ سماجی زندگی میں اس کے لیے "ممنوع درخت" کیا ہے۔ اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ جس "درخت" کو نہ پانے کی وجہ سے منفی سوچ میں مبتلا ہو رہا تھا، وہ دراصل اس کے لیے "ممنوع درخت" کی حیثیت رکھتا تھا، اور اسے حاصل کرنا اس کے لیے فائدے کی بجائے نقصان کا سبب بنتا۔

افراد (individuals) کے بارے میں یہ المیہ پوری تاریخ میں پیش آیا ہے۔ تقریباً تمام انسانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ تجرباتِ حیات کے دوران کسی نہ کسی اعتبار سے منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ منفی سوچ میں جیتے ہیں اور منفی سوچ میں مرتے ہیں۔ کسی شخص کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے خواہشات (desires) کی تکمیل (fulfilment) چاہتا تھا، مگر یہ تکمیل اس کو نہیں مل پاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مایوسی کی حالت میں جیتا ہے، اور مایوسی کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ کسی نے آئڈیل انصاف (ideal justice) کو ایک نشانہ بنایا، مگر وہ جدو جہد کے باوجود آئڈیل انصاف نہ پاسکا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فرسٹریشن کا شکار ہو کر رہ گیا۔ کسی نے یہ چاہا کہ وہ اسی دنیا میں اپنی جنت تعمیر کرے، مگر ساری کوشش کے باوجود وہ اپنی مطلوب جنت کی تعمیر نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف ناامیدی کا ایک کیس بن کر رہ گیا۔

افراد کے بارے میں یہ المیہ (tragedy) پوری تاریخ میں نظر آتا ہے۔ اس کا مشترک سبب یہ ہے کہ ہر انسان نے اپنے لیے ایک ایسی چیز کو حاصل کرنا چاہا جو خالق کے منصوبے کے مطابق، اس کے لیے "ممنوع درخت" کی حیثیت رکھتا تھا، اس بنا پر وہ اس کے لیے قابلِ حصول ہی نہ تھا، اس صورت حال نے انسانی تاریخ کو عملاً انسانی تمناؤں کا ایک وسیع قبرستان بنا دیا۔

یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ تاریخ میں بار بار یہ حادثہ پیش آرہا ہے کہ قومیں یا قوموں کے لیڈر

اپنے لیے ایسا نشانہ بنا تے ہیں۔ جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے ان کے لیے ناقابل حصول (unachievable) ہوتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کرتے ہیں وہ اپنے انجام کے اعتبار سے ان کے لیے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔وہ بڑے بڑے حوصلوں کے ساتھ زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔اور آخر میں وہ مایوسی کا شکار ہوکر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ سکندر اعظم (Alexander the Great) 336 قبل مسیح میں یونان کا بادشاہ بنا۔اس نے اپنے لیے ایک ناقابلِ حصول پولٹکل نشانہ بنایا، یعنی یہ کہ وہ فوجی طاقت کے ذریعے ساری دنیا کو فتح کرے ۔مگر عملاً یہ ہوا کہ وہ صرف 33 سال کی عمر میں شدید مایوسی کی حالت میں مر گیا۔

ہٹلر (Adolf Hitler, b. 1889) 1933 میں جرمنی کا چانسلر (Chancellor) مقرر ہوا۔مگر اس نے اپنے لیے ایک ناقابل حصول سیاسی نشانہ بنایا، یعنی پورے یورپ میں جرمنی کا اقتدار قائم کرے۔مگر بڑے بڑے فوجی اقدامات کے باوجود وہ اپنا نشانہ پورا نہ کرسکا۔یہاں تک کہ 1945 میں شدید مایوسی کی حالت میں اس نے خودکشی کرلی، جب کہ اس کی عمر ابھی صرف 56 سال تھی۔

اس طرح کی ایک مثال کمیونسٹ پارٹی کی ہے۔کمیونسٹ پارٹی نے 1917 میں روس میں اقتدار حاصل کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے لیے ایک ناقابلِ حصول نشانہ بنایا ،یعنی کمیونسٹ آئڈیالوجی کو ساری دنیا میں ایکسپورٹ کرنا۔اس مقصد کے لیے اس نے بہت فوجی کارروائیاں کیں۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ تھا کہ اس نے 1979 میں افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کردیں، مگر اس کا نتیجہ برعکس صورت میں نکلا 1991 میں خود کمیونسٹ ایمپائر (Soviet Union) ٹوٹ گیا، عالمی نقشے پر وہ سپر پاور کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔

اسی نوعیت کی ایک مثال امریکا ہے۔اس نے بھی یہی کیا کہ اپنے لیے ایک ناقابل حصول نشانہ بنایا۔امریکا کے پولٹکل لیڈر براک اوباما کو دوسری بار صدر امریکا منتخب کیا گیا۔اس سلسلے میں واشنگٹن میں 22 جنوری 2013 کو ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی۔اس موقع پر صدر اوباما نے ایک افتتاحی تقریر کی۔اس تقریر میں انھوں نے امریکا کی عالمی پالیسی کو دہراتے ہوئے کہا کہ— امریکا ساری دنیا میں جمہوریت کو اپنی سپورٹ دیتا رہے گا:

We will support democracy from Asia to Africa, from the Americas to the Middle East.

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ امریکا کی یہ پالیسی اس کے لیے پوری طرح کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter-productive) ثابت ہوئی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکا ایک مضبوط قوم (strong nation) کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ امریکا کی اقتصادیات کو ایک مستحکم اقتصادیات سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اکیسویں صدی میں امریکا نے اپنی یہ حیثیت کھودی ہے۔ امریکا کی مذکورہ خارجہ پالیسی نے اس کو صرف یہ تحفہ دیا کہ امریکا کی سپر پاور حیثیت دنیا کی نظر میں مشتبہ ہوگئی۔

اس معاملے میں خود ملت مسلمہ کا حال بھی یہی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اور ان رہنماؤں کی پیروی کرتے ہوئے تقریباً تمام مسلمانوں نے یہ فرض کرلیا کہ دنیا کی تمام قومیں ان کی دشمن ہیں، ہر جگہ ان کے خلاف سازش جاری ہے، ان کی حکومتوں کو توڑا جا رہا ہے، ان کے سیاسی دبدبہ کو ختم کیا جارہا ہے۔ اس سوچ کے تحت تمام دنیا کے مسلمان مفروضہ دشمنوں کے خلاف مفروضہ جہاد میں مشغول ہوگئے۔ اس جہاد میں عملاً پوری ملت مسلمہ شامل ہے۔ کچھ لوگ انفعالی جہاد (passive jihad) کے طور پر اور کچھ لوگ عملی جہاد (active jihad) کے طور پر اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔

مگر اس معاملے میں ملت مسلمہ کا انجام بھی وہی ہور ہا ہے، جو دوسری قوموں کا ہو رہا ہے۔ یعنی تقریباً 200 سال کی جدوجہد اور قربانی کے باوجود ان کا مقصود حاصل نہیں ہوا، بلکہ یہ ہوا کہ ملت مسلمہ کی تباہی میں ناقابلِ تلافی حد تک اضافہ ہوگیا۔ اس کی ایک مثال فلسطین ہے۔ فلسطین میں 1948 میں تمام عرب اور غیر عرب مسلمانوں کی حمایت سے اسرائیل کے خلاف جہاد شروع ہوا، مگر نتیجہ برعکس صورت میں نکلا۔ 1948 میں جب جہادِ فلسطین شروع ہوا۔ اس وقت فلسطین کا تقریباً نصف حصہ بشمول یروشلم (مسجد اقصی اور بیت المقدس، وغیرہ) عربوں کے پاس تھا، مگر آج عربوں کے پاس فلسطین کا اتنا کم حصہ ہے، جو عملاً نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ الم ناک واقعات جو مسلمانوں اور دوسری قوموں کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ ان سب کا مشترک سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے "ممنوع درخت" کے قانون فطرت کی خلاف ورزی کرنا۔ ہر قوم نے ایک ایسی منزل کی طرف رخ شروع کررکھا ہے، جہاں پہنچنا اس کے لیے مقدر نہیں۔

اس عالمی مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر قوم اپنے معاملے کا ازسرنو جائزہ لے۔ وہ خالق کے منصوبے کو سمجھے، وہ غیر جانب دارانہ سوچ کے تحت یہ دریافت کرے کہ خالق کے منصوبے کے تحت اس کا ممنوع درخت (forbidden tree) کیا ہے اور پھر اپنی سابقہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ وہ ممنوع میدان کو چھوڑے اور جو میدان اس کے لیے کھلا ہوا ہے، اس میں ازسرِنو اپنی جدوجہد کا آغاز کرے۔ یہی کامیابی کا واحد راز ہے۔ اس کے بغیر اس دنیا میں کسی کے لیے بھی کامیابی کا حصول ممکن نہیں، نہ کسی فرد کے لیے اور نہ کسی قوم کے لیے۔ اس اصول کا خلاصہ مختصر طور پر یہ ہے: اپنے شجر ممنوعہ کو دریافت کرنا اور اس سے دوری اختیار کرتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنانا۔

****

حاصلِ تجربہ

میری عمر 66 سال ہوگئی۔ اگر مجھے بتانا ہو کہ میری پوری زندگی کے مطالعہ اور تجربہ کا آخری حاصل کیا ہے، تو میں کہوں گا کہ — اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت میں ایک مسٹر نتھنگ (Mr. Nothing) پیدا کیا اور اس کے اوپر (thing) کا پردہ ڈال دیا۔

انسان کے پاس بظاہر دماغ ہے، علم ہے، طاقت ہے، اسباب ووسائل ہیں۔ مگر یہ سب کا سب ظاہری پردہ ہے۔ اس پردہ کے اندر داخل ہو کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کا ایک علیحدہ وجود ہے۔ اس کا یہ علیحدہ وجود دنیا سے لے کر آخرت تک باقی رہے گا۔ انسان کا سارا معاملہ سراسر اللہ کی ذات پر منحصر ہے۔ دنیا میں بھی اگر وہ کچھ پاتا ہے تو وہ اللہ کے دیے سے پاتا ہے۔ اور آخرت میں بھی وہ جو کچھ پائے گا اللہ کے دیے سے پائے گا۔

انسان کے پاس ارادہ ہے مگر حسبِ ارادہ نتیجہ ظاہر کرنے کی اس کے اندر طاقت نہیں۔ انسان کے پاس فکر ہے، مگر حالات کے اوپر اس کا کنٹرول نہیں۔ اس کو چاہنے کا اختیار ہے، مگر اس کو کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ (ڈائری، 26 فروری 1990)

خدا کو پانا

اس وقت میری گفتگو کا موضوع خدا اور خدا کی وحدت ہے۔ یہ موضوع بلا شبہ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع ہے۔ زمین و آسمان گواہ ہیں کہ میں سب سے زیادہ توحید کے موضوع پر سوچتا ہوں۔ میں سب سے زیادہ خدا کی باتوں میں گم رہتا ہوں۔

مگر قرآن میں آیا ہے کہ إِذا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (8:2)۔ یعنی، جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ اور فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَخَرَّ مُوسى صَعِقاً (7:143)۔ یعنی، جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی کی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

خدا تو وہ ہے جہاں زبانیں بند ہو جاتی ہیں، پھر خدا کے بارے میں بولا جائے تو کیا بولا جائے۔ خدا تو وہ ہے جس کے سامنے آتے ہی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے مشاہدہ کو بیان کیا جائے تو کس طرح بیان کیا جائے۔ خدا تو وہ ہے کہ جب وہ تجلی کرتا ہے تو جہاں وہ اپنی تجلی کرتا ہے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے (الاعراف، 7:143)، پھر کہاں سے وہ دل لایا جائے جو خدا جیسی ہستی کا چرچا کر سکے۔

خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں، خدا میری دریافت ہے۔ (احسان کے درجہ میں) خدا کو میں نے دیکھا ہے۔ خدا کو میں نے چھوا ہے۔ بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے جس پر خدا اترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دیے۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا پر بولنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا کی حمد اور تعریف کرنی عام تقریروں کی طرح صرف ایک تقریر کر دینے کی بات نہیں۔

غالباً 25 سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں اعظم گڑھ (یوپی) میں تھا۔ وہاں ایک صاحب (شاہ نصیر احمد) نے مجھ سے پوچھا: ”کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے“۔ میری زبان سے فوراً یہ الفاظ نکلے: ”کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا“۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا سورج اور چاند سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ آنکھ اسی لیے دی گئی ہے کہ وہ خدا کو دیکھے۔ یہ دماغ اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ

خدا کا ادراک کرے۔ بخدا وہ آنکھ بے نور ہے جس کو خدا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ انسان بے دماغ ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا، یا یہ کہ خدا کو پایا نہیں جا سکتا۔

خدا بلاشبہ اتنا بڑا ہے کہ وہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں سماتا۔ مگر بلاشبہ وہ تمام چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم خدا کو اس کی ذات میں نہیں دیکھ سکتے۔ مگر خدا کو اس کی صفات میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں اور ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں یہی خدا کو دیکھنا ہے، یہی خدا کو پانا ہے۔

کار کو کارخانہ کا انجینئر بناتا ہے۔ انجینئر کار میں ہر وقت بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ مگر جس شخص نے کار میں صرف کار کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ کار کو دیکھنے والا وہ ہے جو کار کو دیکھتے ہی اس کے انجینئر کو بھی دیکھ لے۔ اسی طرح انسان خدا کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ اگر آپ نے سورج میں صرف سورج کو دیکھا تو آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ سورج کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے سورج میں خدا کے روشن چہرہ کو دیکھ لیا ہو۔ جس نے پہاڑ میں صرف پہاڑ کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ پہاڑ کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے پہاڑ میں خدا کی عظمتوں کو پالیا ہو۔ خدا کوئی دور کی چیز نہیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ چڑیوں کے چہچہے میں بول رہا ہے۔ وہ پھولوں کی لطافت میں مسکرا رہا ہے۔ وہ ہواؤں کے جھونکے میں آپ کو چھو رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا ہر طرف اور ہر جگہ ہے۔ وہ ہم سے بالکل الگ ہے، اسی کے ساتھ وہ ہم سے انتہائی قریب ہے۔ پھر بھی جو انسان خدا کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے۔ اس کے باوجود جو انسان خدا کو نہ پائے وہ محرومی کی اس انتہا پر ہے جس کے آگے محرومی کا کوئی درجہ نہیں۔

خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو پانا۔ کون ہے جو اپنے آپ کو پائے ہوئے نہ ہو۔ اس لیے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو خدا کو پانا چاہے پھر بھی وہ اس کو نہ پا سکے۔ جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے وہ سورج کو نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے شخص کے چاروں طرف سورج اپنی بے پناہ روشنی کے ساتھ موجود ہوگا مگر وہ سورج کو نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح خدا ہر لمحہ آدمی کے چاروں طرف موجود ہے۔ مگر جس شخص نے اپنی بصیرت کو دھندلا کر چکا ہو وہ کبھی خدا کو دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔

(تقریر بمقام بھوپال، 19 اپریل 1986)

اِن شاء اللہ

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب کسی کام کے بارے میں اپنے ارادہ کا اظہار کرے تو اس کے ساتھ ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) بھی ضرور کہے (الکہف، 18:23)۔ مثلاً ایک شخص دہلی سے بمبئی جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس طرح نہ کہے کہ کل میں بمبئی جاؤں گا، بلکہ یوں کہے کہ ان شاء اللہ کل میں بمبئی جاؤں گا۔

یہ کلمہ گویا اس حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے کہ میری چاہ صرف اس وقت پوری ہوگی جب کہ اللہ کی چاہ بھی اس میں شامل ہوجائے۔ یہ اپنے چاہنے میں اللہ کے چاہنے کو ملانا ہے، اپنے ارادے کے ساتھ اللہ کے ارادے کو شامل کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان ارادہ کرتا ہے اور اس کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ مگر کسی کوشش کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی شامل ہوجائے۔ اسی کو عربی میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے ہے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السَّعْيُ مِنِّي وَالإِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ)۔

اس اعتبار سے خدا اور بندے کا معاملہ گویا دندانہ دار پہیہ (cogwheel) کا معاملہ ہے۔ ایک پہیہ خدا کا ہے اور دوسرا پہیہ انسان کا۔ جب دونوں کے دندانے ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی مشین چل پڑتی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ خدا کے پہیہ سے الگ ہوکر اپنا پہیہ چلانا چاہے تو بظاہر حرکت کے باوجود وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ پوری مشین کے چلنے کے لیے ضروری تھا کہ خدا کے پہیہ کا دندانہ بھی انسان کے پہیہ کے ساتھ شامل ہو۔

ان شاء اللہ کا کلمہ، باعتبارِ حقیقت، ایک دُعا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ انسان کے کاگ میں اپنا کاگ ملا دے تاکہ زندگی کی مشین چل پڑے اور اپنے مطلوبہ انجام تک پہونچے۔ ان شاء اللہ کہنا گویا زندگی کے سفر میں مالکِ کائنات کو اپنے ساتھ لینا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ خود مالک کائنات اس کا ہم سفر ہوجائے۔ اس کو منزل تک پہنچنے سے کون روک سکتا ہے۔

اسلامی سرگرمی

کچھ مسلمان اگر اسلام کے نام پر جمع ہوتے ہوں، یا اسلام کے نام پر کچھ سرگرمی دکھا رہے ہوں، تو یہی ان کے لیے اسلام پر قائم ہونے کی کافی علامت نہیں ہے۔ اس قسم کی سرگرمی (activity) لوگوں کو ایک ملّی تسکین دے سکتی ہے، لیکن وہ اسلام کے مقصد پر قائم ہونے کے لیے کافی نہیں۔

اسلام کے نام پر سرگرمی وہ ہے جو ایک بامقصد سرگرمی ہو۔ مثلاً اسلام کے نام پر آپ کسی جگہ جمع ہوجائیں، اور اسلام کے نام پر تقریریں سنیں، تو اس سے آپ کو ربانی ٹیک اوے (takeaway) ملنا چاہیے (الانفال، 8:2)۔ جس تقریر یا تحریر سے آپ کو ربانی ٹیک اوے نہ ملے، وہ اسلام کی سرگرمی نہیں تھی، بلکہ کسی اور مقصد کے تحت کی گئی سرگرمی تھی، جس کو آپ نے غلطی سے اسلام کی سرگرمی سمجھ لیا۔

اسلام کی سرگرمی وہ ہے، جو شرکاء کو متعین مقصدِ حیات دے۔ جس سے لوگوں کے دلوں میں اللہ کی محبت پیدا ہو۔ جس سے لوگ لوٹیں تو وہ اللہ کی یاد اور آخرت کی فکر کا جذبہ لے کر لوٹیں۔ ان کے اندر تمام انسانوں کی خیر خواہی کا جذبہ بیدار ہوجائے۔ اسلام کے نام پر ایسی سرگرمی جو خدا اور آخرت کے ذکر سے خالی ہو، وہ کچھ اور ہوسکتی ہے، لیکن وہ حقیقی معنوں میں اسلامی سرگرمی نہیں۔

ہر چیز کو جانچنے کا ایک معیار (criterion) ہوتا ہے۔ اسلام کے نام پر کی گئی سرگرمی کا معیار یہ ہے کہ اس سے خدا کا تعلق بڑھے، اور آخرت رخی اسپرٹ بیدار ہو۔ جو سرگرمی اسلام کے نام پر کی گئی ہو، لیکن جو لوگ اس میں شرکت کرکے واپس لوٹیں، اور ان کے پاس مذکورہ قسم کا ٹیک اوے نہ ہو، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی اور سرگرمی تھی، جس کو انھوں نے غلط فہمی سے اسلامی سرگرمی سمجھ لیا۔

اسلامی تقریر یا اسلامی تحریر وہ ہے، جس سے لوگوں میں خدا اور آخرت کی اسپرٹ بیدار ہو، جس سے لوگوں میں جنت کا شوق بڑھے، اور وہ آخرت کی پکڑ کے بارے میں زیادہ حساس ہوجائیں۔ جو لوگوں کے لیے خدا اور آخرت کی غذا دینے والا ثابت ہو۔

خدا کی رحمت

بارش کے موسم میں بارش نہ ہو تو کسان پریشان ہو جاتے ہیں کیوں کہ بارش ہی کے اوپر کھیتی کا دارومدار ہے۔ بارش سے کھیتوں میں فصل اگتی ہے اور سال بھر کی روزی حاصل ہوتی ہے۔ بارش نہ ہو تو کسانوں کے کھیت ویران ہو جائیں، ہم کو اپنی خوراک کے لیے غلہ نہ ملے۔ اسی طرح ایک اور بارش ہے۔ یہ اللہ کا وہ فضل ہے جس سے نیک عمل کی توفیق حاصل ہوتی ہے، جس سے ہمارے ایمان کی زمین پر اسلامی کردار کی کھیتیاں اگتی ہیں۔ اللہ کی توفیق نہ ملے تو ہمارے ایمان کی زمین سوکھی پڑی رہ جائے اور اس سے نیک اعمال کی وہ فصل نہ اُگے گی، جو جنت کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ توفیق کی اہمیت اسلامی کردار پیدا کرنے میں اسی طرح ہے جیسے بارش کی اہمیت کھیتوں میں فصل اگانے کے لیے۔

جب بادلوں والی بارش رکتی ہے تو کسان بے حد پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب عمل کی توفیق والی بارش رکے تو مومن بندہ کو بے چین ہو جانا چاہیے۔ اس کو اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کیوں اس کے اوپر توفیقِ الٰہی کی بارش رک گئی۔ ایسا کیوں ہے کہ اس کے اندر وہ جذبات نہیں امنڈ رہے ہیں جو اللہ کے پسندیدہ اعمال کا محرک بنتے ہیں۔

جب آپ کو ایک اچھی نماز پڑھنے کی سعادت ملتی ہے تو درحقیقت وہ رحمتِ الٰہی کی بارش کی ایک بوند ہوتی ہے جو آپ کے اوپر ٹپکتی ہے۔ جب آپ کو خالص اللہ کی خاطر روزہ رکھنا اور حج کرنا نصیب ہوتا ہے، جب آپ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی خوشی حاصل کرتے ہیں تو یہ سب بھی اللہ کی اسی بارش کی چھینٹے ہوتے ہیں جو آپ کو اللہ کی توفیق سے پہنچتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ کی یاد سے آپ کا دل سرشار ہو اٹھتا ہے، جب آپ کی آنکھیں اللہ کی راہ میں رونے کی توفیق پاتی ہیں، جب آپ کی زندگی میں درد کے وہ لمحات آتے ہیں جو آپ کو اللہ کے خوف و محبت سے تڑپا دینے والے ہوں تو یہ سب بھی اسی اَن دیکھی بارش کا فضل ہوتا ہے، جو اللہ کی طرف سے آپ کے اوپر برستا ہے۔ جب آپ اپنے بھائی کی کوئی خدمت کرتے ہیں،

جب دوسرے کے دکھ سے آپ کو دکھ اور دوسرے کے سکھ سے آپ کو سکھ ہوتا ہے، جب آپ دل کی سچائی کے ساتھ ان کاموں میں سے کوئی کام کرتے ہیں جن کو بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا نام دیا گیا ہے تو یہ سب اسی خدائی بارش کے چھینٹے ہوتے ہیں جو آپ کے اوپر اس کی رحمتِ خاص سے برستے ہیں۔

ہم سب مسلمان ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر یاد رکھیں مسلمان ہونا یا مسلمان گھر میں پیدا ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ کو ایمان و اسلام کی زمین حاصل ہے۔ مگر ہر کسان جانتا ہے کہ صرف زمین کا مالک ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس زمین کو پانی کی سہولتیں حاصل ہوں۔ صحرا میں ہر طرف زمین ہی زمین ہوتی ہے مگر وہ کھیتی کے لیے بیکار ہے۔ وہاں ہری بھری فصل کے بجائے ہر وقت ریت اڑتی رہتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہاں پانی کا ایک قطرہ نہیں۔ ایک کسان کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس کے پاس کھیت ہیں، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ کھیت سے فصل اگانے کے لیے ضروری ہے کہ پانی اس کھیت تک پہنچے۔ سوکھا کھیت اسی وقت لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں بدلتا ہے، جب وہ پانی سے سیراب ہوتا ہے۔

اسی طرح ہمارے لیے صرف یہ بات کافی نہیں کہ ہم ایمان و اسلام کو ماننے کا زبانی دعویٰ کریں۔ اس کے ساتھ لازمی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری اسلامی زمین پر خدا کی توفیق کی بارش بھی ہو رہی ہو۔ ہمارے دل میں اللہ سے خوف ومحبت کی وہ بوندیں ٹپکیں، جو آدمی کے اندر ربانی ہلچل پیدا کرتی ہیں اور اس کو نیک کام کرنے پر ابھارتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ خدا کی اس بارش میں اس کو حصہ مل رہا ہے یا نہیں۔ اس کے اوپر رحمتوں کا وہ فضل برس رہا ہے یا نہیں جس سے خدا کے پسندیدہ اعمال کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس روحانی بارش کی بوندیں آپ کے اوپر ٹپک رہی ہیں تو خدا کا شکر ادا کریں کیونکہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو اس دنیا میں کسی کو ملتی ہے۔ اور اگر اس بارش کے چھینٹے آپ کی ہستی کو نم نہ کر رہے ہوں تو آپ کو اس سے زیادہ بے چینی ہونا چاہیے جتنا کوئی کسان اس وقت بے چین ہوتا ہے جب بادل اس کی زمین پر بارش برسانے سے رک گئے ہوں۔ کیونکہ بادلوں والی بارش کسی کو صرف ایک سال کے غلہ سے محروم کرتی ہے، جب کہ توفیقِ

عمل کی بارش کا رکنا آدمی کو اس سخت ترین اندیشہ میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائے۔

کوئی آدمی نماز، روزہ اور اس طرح کے دوسرے اعمال کر رہا ہے، مگر ان کی حیثیت اس کے لیے ایسی ہے جیسے کچھ بے روح رسم ہو جس کو وقتاً فوقتاً ادا کر لیا جائے، تب اس کو مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہی عمل اسلامی عمل ہے جس کے ساتھ آدمی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہو جائیں، جس کے اندر اس کی روح کی تڑپ گھل مل گئی ہو۔ جو عمل آدمی کی زندگی کا محض ایک خشک ضمیمہ (index) ہے وہ محض ایک بے فائدہ رسم ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے نہ آخرت میں۔

ہم میں سے ہر شخص کو اس اعتبار سے اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر بارش برسانے والے بادل رک جائیں تو ہم استسقا کی نماز پڑھتے ہیں۔ لوگ پانی حاصل کرنے کے دوسرے طریقوں کی طرف دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح توفیقِ عمل کی بارش رکنے پر آپ کو چوکنّا ہو جانا چاہیے۔ آپ کو خدا سے دعا اور التجا کرنا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنی نعمتِ توفیق سے محروم نہ کرے۔

اگر آپ کو زندہ عبادت کی توفیق نہ مل رہی ہو، اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا شوق آپ سے رخصت ہو گیا ہو، اگر دوسروں کا بھلا دیکھ کر آپ خوش نہ ہوتے ہوں، اگر اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرتا ہو، اگر آپ اپنے فائدے کے پیچھے دوسرے کا نقصان بھول جاتے ہوں، اگر اپنے صاحبِ معاملہ کے ساتھ انصاف کرنا آپ کو گوارا نہ ہوتا ہو، کسی سے شکایت پیدا ہونے کے بعد اگر آپ اس کو معاف کرنے پر راضی نہ ہوتے ہوں، اگر اس طرح کی باتیں ہوں تو سمجھ لیں کہ آپ کے ایمان کی زمین سوکھی پڑی ہوئی ہے۔ آپ کے اوپر اللہ اپنی توفیق کی بارش نہیں برسا رہا ہے۔ خدا کی رحمتوں سے محرومی نے آپ کے اندر اسلام کے پودے کو خشک کر دیا ہے۔

اسی طرح آپ کو اس وقت بھی بے چین ہو جانا چاہیے جب آپ اپنا یہ حال پائیں کہ آپ انہی دینی کاموں میں رغبت رکھتے ہوں جن سے آپ کی دنیا کو کوئی نقصان نہ ہو، جس میں آپ کے مادی مفادات پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، جس میں سستی قیمتوں پر جنت کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں، جس میں کچھ کیے بغیر کرنے کا تمغہ مل جاتا ہے، جس میں الفاظ بول کر عمل کا کریڈٹ حاصل

ہوتا ہے۔ اس قسم کے ”دین“ کی طرف لپکنا اور نفس کو دبانے اور جذبات کی قربانی دینے والے دین سے بے پروا ہونا دینداری کی حالت نہیں بلکہ غفلت کی حالت ہے۔

اگر آپ کا یہ حال ہو کہ آپ انہی دینی کاموں کی طرف دوڑتے ہوں جن میں دنیاوی نفع ملنے والا ہو، جن میں شہرت اور عزت کی چاشنی ہو، جن میں آپ کی عوامی تصویر میں اضافہ ہوتا ہو، جن میں آپ اپنے کو نمایاں کرنے کے مواقع پا رہے ہوں، جن میں عمل کی قیمت دنیاوی صورت میں وصول ہوتی ہو، جن میں دینی کام کی قیمت پذیرائی کی صورت میں مل رہی ہو۔ آپ دنیاوی پہلو رکھنے والے دینی کام میں تو خوب تیزی دکھائیں اور جس دینی کام میں کوئی دنیاوی چاشنی نہ ہو، اس سے بے رغبت رہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کی توفیق میں حصہ پانے سے محروم ہیں۔ کیونکہ دولت اور عزت والے دین کی طرف دوڑنا دین کے نام پر اپنے نفس کی طرف دوڑنا ہے، نہ کہ حقیقتاً خدا کے دین کی طرف دوڑنا۔

ان تمام حالتوں میں آپ کو مطمئن ہونے کا موقع نہیں۔ آپ کو بے تاب ہو کر خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ آپ کو خدا کی بارشِ رحمت کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیے، قبل اس کے کہ آپ کا سوکھا ہوا پودا خدا کے باغ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

****

جنت میں اہلِ جنت کا ایک مشغلہ یہ ہوگا کہ وہ کلمات اللہ کا مطالعہ کریں، وہ کلمات اللہ کو دریافت کریں، اور پھر کلمات اللہ کو قلم بند کریں۔ یہ ربانی انسان کون ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا کے اندر قرآن کے الفاظ میں آلاء اللہ (7:69) اور کلمات اللہ (18:109) کی سوچ میں جینے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کو یکجا کر کے جو دنیا بنے گی، اسی کا نام جنت ہے۔ وہ ایک نیا دورِ تہذیب (age of civilization) ہوگا۔ یہاں کی ہر چیز اعلیٰ معیار کی ہوگی۔ یہاں کی سوسائٹی اعلیٰ سوسائٹی ہوگی۔ یہاں ربانی معرفت کی اَن فولڈنگ کے اعلیٰ ادارے ہوں گے۔

اتحاد کی نفسیات

اتحاد واتفاق کسی بڑے کام کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ مگر اتحاد کبھی مطلق معنوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی یہ کہ ٹیم یا گروپ کے تمام افراد کی سوچ ایک ہو، اور اس بنا پر ان کے اندر اتحاد قائم ہوجائے۔ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اتحاد ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، نہ کہ مطلق وزڈم (absolute wisdom) کی بنیاد پر۔

اصل یہ ہے کہ اتحاد کبھی اتفاق رائے کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے، جب کہ لوگوں کے سامنے ایک مشترک نشانہ (goal) ہو، اور اس مشترک نشانے کے حصول کے لیے مختلف لوگ اپنی ذاتی آرا کو الگ رکھ کر مشترک نشانے کی بنیاد پر عملاً متحد ہوجائیں۔ یعنی اختلافِ رائے کے باوجود مشترک نشانے کی خاطر لوگوں کا عملاً متحد ہوجانا۔

ہر انسان ایک مستقل شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر انسان کا زاویہ نظر (angle of vision) الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لیے اجتماعی جدو جہد میں کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ افراد کے درمیان کلی طور پر آرا کا اتحاد ہوجائے۔ بلکہ لوگوں کے درمیان اتحاد اس سوچ کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ کسی عظیم مقصد کے لیے اجتماعی کوشش کی جائے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ لوگ انفرادی سطح پر اپنی آرا کو اپنی ذات کی حد تک محدود رکھیں، اور اجتماعی جدو جہد کے معاملے میں سب مل کر ایک نشانے کے لیے کوشش کریں۔ عملی معنوں میں اسی کا نام اتحاد ہے۔ یہی طریقہ ممکن ہے، اور یہی طریقہ فطرت کے قانون کے مطابق ہے۔

ایک روایتی قصہ میں بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص کے کئی بیٹے تھے۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا، اور ان کو ایک بٹی ہوئی رسی دی کہ اس کو توڑو۔ لڑکے اس رسی کو توڑ نہیں پائے۔ پھر اس نے رسی کو کھول دیا، اور ہر بیٹے کو رسی کی ایک ایک لڑی دی۔ اب ہر ایک نے آسانی سے اس کو توڑ دیا۔ اس کے بعد باپ نے کہا کہ دیکھو، اگر تم متحد رہو گے تو کوئی تم کو توڑ نہیں پائے گا، لیکن اگر تم الگ ہوجاؤ تو کوئی بھی شخص تم کو آسانی سے توڑ ڈالے گا۔

جہنم کی طرف

بعد کے زمانے کے بارے میں ایک لمبی روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک جزء البخاری کے الفاظ میں یہ ہے: دُعَاةٌ عَلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7084)۔ یعنی اس وقت کچھ پکارنے والے ہوں گے جہنم کے دروازے پر، جولوگ بھی ان کی بات مانیں گے، وہ ان کو جہنم میں پھینک دیں گے۔

یہ حدیث امت مسلمہ کے دورزوال کے بارے میں ہے۔ یعنی دورزوال میں امت مسلمہ میں جونئی باتیں پیدا ہوں گی، ان میں سے ایک بات یہ ہوگی کہ کچھ لوگ بظاہر اسلام کا نام لیں گے۔ مگر وہ لوگوں کو اسلام کے نام پر غیر اسلام کی طرف پکاریں گے۔ ان کی یہ پکار بظاہر اسلام کے نام پر ہوگی، مگر حقیقت کے اعتبار سے ان کی منزل جہنم ہوگی۔ جوان کی پکار پر لبیک کہے گا، وہ آخر کار اپنے آپ کو جہنم کے دروازے پر پائے گا۔

اصل یہ ہے کہ دورِزوال میں امت ایسا نہیں کرے گی کہ وہ اسلام کو چھوڑ دے۔ بلکہ یہ ہوگا کہ امت عملاً دوسری قوموں کی طرح ایک قوم بن جائے گی۔ لیکن امت کے لوگ اپنی قومی سرگرمیوں کے لیے ایسے الفاظ بولیں گے، جو بظاہر اسلامی ڈکشنری کا حصہ معلوم ہوں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ قومی ڈکشنری کا حصہ ہوں گے۔ مثلاً وہ اپنی قومی لڑائی کو جہاد کا نام دیں گے، وہ قومی سرگرمیوں کو اسلامی سرگرمیوں کا نام دیں گے، وہ اپنی قومی سیاست کو اسلامی خلافت کہیں گے، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کی غیر اسلامی پکار کی بہت سی مثالیں پیدا ہوئی ہیں۔

موجودہ دور میں انھی قسم کی باتوں کو عملاً امت مسلمہ کا دینی نصب العین قرار دے کر اس کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں، مگر یہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن وحدیث کے واضح دلائل سے ثابت نہ ہو، دین کے نام پر اس کو پھیلانا باطل ہے۔ اس قسم کی بے بنیاد باتیں عملاً نہ صرف لوگوں کو حقیقی دین سے دور کردیتی ہیں، بلکہ ان کے اندر نفرت اور تصادم کا جذبہ بھی ابھارتی ہیں، جو بذاتِ خود ایک فتنہ انگیز اور ناپسندیدہ رویہ ہے۔

یک طرفہ رپورٹنگ

آج کل جس مسلمان سے بات کیجیے، وہ ہمیشہ ایک ہی بات کو دہرائے گا، اور وہ مسلمانوں پر ظلم کی بات ہے۔ اگر ان سے مزید گفتگو کیجیے تو وہ اخباری خبروں (یا کسی غیر متحقق انسان کی سوشل میڈیا پر موجود ایک ویڈیو) کا حوالہ دے گا۔ مگر یہ سب یک طرفہ خبر رسانی کی مثالیں ہیں۔ میڈیا انتخابی نیوز (selective news) کی انڈسٹری ہے۔ میڈیا صرف اُن باتوں کو منتخب کرتا ہے، جن میں کوئی سنسنی خیز پہلو ہو۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی خبروں کو قبول کرنے میں سخت احتیاط کا طریقہ اختیار کریں۔ قرآن کے مطابق، ایسی خبروں کو مان لینا درست نہیں ہے، بلکہ رائے بنانے سے پہلے غیر جانبدارانہ انداز میں ان کی تحقیق کر لینی چاہیے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم ان الفاظ میں دیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ مفسر ابن جریر نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: أَمْهِلُوا حتى تَعرِفوا صحَّتَه، لا تعجَلوا بقبولِه (تفسیر الطبری، جلد 21، صفحہ 349)۔ یعنی، جلدی نہ کرو، پہلے یہ تحقیق کر لو کہ یہ بات درست ہے یا نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا تھا: جب تمہارے پاس دو آدمی مقدمہ لے کر آئیں، تو پہلے والے کے حق میں فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے کا بھی بیان نہ سن لو (فَلا تَقْضِ لِلأَوَّلِ حَتى تَسْمعَ كَلامَ الآخَر)، تب تم بہتر طریقے سے فیصلہ کر سکو گے (سنن ترمذی، حدیث نمبر 1380)۔ یک طرفہ رپورٹنگ کا طریقہ بلاشبہ خلافِ اسلام عمل ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں یک طرفہ رپورٹنگ کا انداز بہت زیادہ عام ہے۔ حتیٰ کہ جب کوئی مسلمان ملّی جوش میں ایک خبر پھیلا رہا ہوتا ہے، تو اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ یک طرفہ رپورٹنگ کی غلطی کر رہا ہے۔

ہائی پروفائل، لو پروفائل

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار کو سب سے اعلیٰ طریق کار بتایا گیا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں اسوہ حسنہ کہا گیا ہے (33:21)۔ اسوہ حسنہ گویا موثر ترین تدبیر (most effective planning) کا نمونہ ہے۔ امریکی رائٹر ڈاکٹر مائکل ہارٹ (پیدائش 1932) نے 1978 میں اپنی کتاب دی ہنڈریڈ (The Hundred) شائع کی۔ اس کتاب میں اس نے پوری تاریخ کے کامیاب ترین انسانوں کی فہرست تیار کی ہے۔ اس میں مائکل ہارٹ نے پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے کامیاب انسان بتایا ہے۔ لیکن یہ کامیابی آپ نے کس طریق کار کو اختیار کرکے حاصل کی، یہ حقیقت اس کتاب سے معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے اس مسئلے پر غور کیا تو میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ پیغمبر اسلام کے طریقِ کار کا اگر خلاصہ کیا جائے، تو شاید وہ یہ ہوگا — لو پروفائل میں کام کرنا۔

پیغمبر اسلام نے اپنی پوری زندگی میں لو پروفائل کا طریقہ اختیار کیا۔ لو پروفائل میں کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کی پلاننگ غیر نزاعی طریق کار کی بنیاد پر کرے، یعنی پلاننگ اس طرح خاموش انداز میں کرنا کہ فریقِ ثانی اس سے بالکل بے خبر رہے، اور کام اس طرح جاری رہے کہ فریقِ ثانی اس وقت باخبر ہو پائے جب کہ کام عملاً اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچ چکا ہو۔ اس کا ایک عملی نمونہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 8 ہجری میں جب مکہ کی طرف مارچ کیا تو یہ سفر انتہائی خفیہ انداز میں کیا، یہاں تک کہ سفر سے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی: اللَّهمّ خُذْ الْعُيُونَ وَالْأَخْبَارَ عَنْ قُرَيْشٍ حَتَّى نَبْغَتَهَا فِي بِلَادِهَا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 397)۔ یعنی اے اللہ، جاسوسوں اور خبروں کو قریش سے روک دے، یہاں تک کہ اچانک ہم ان کے شہر پہنچ جائیں۔ یہ مکہ میں داخلے کی پلاننگ تھی، نہ کہ فتح مکہ کا عمل۔

اس دنیا میں کامیاب طریقہ کار صرف ایک ہے، اور وہ ہے لو پروفائل میں کام کرنا۔ اس طریقہ کار میں کسی کی طرف سے کوئی ری ایکشن پیدا نہیں ہوتا، اور آخر وقت تک کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ایک دَور کا مشاہدہ

راقم الحروف کی پیدائش پاسپورٹ کے مطابق، یکم جنوری 1925 کی ہے۔ میں نے اس پورے زمانے کو دیکھا ہے، جسے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: برٹش دور، آزادی کے بعد کا دور ہے جو بہت جلد غیر کانگریسی مسلمانوں کا دور بن گیا، اور تیسرے دور کو مسلم نقطۂ نظر سے اینٹی بی جے پی دور کہنا صحیح ہوگا۔

یہ تینوں ادوار ہنگامہ خیز مسلم قیادتی سرگرمیوں کے باوجود بے نتیجہ رہا، ان سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ اب پوری امت عملاً اس دور میں ہے، جس کو بلائنڈ ایلی (blind alley) کہا جاسکتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے اس مقام پر ہوں، جہاں سے آگے کوئی چوتھا دور دیکھنا شاید میرے لیے مقدر نہیں۔ میری اپنی سمجھ کے مطابق، پوری امت میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بظاہر مثبت سوچ کی بنیاد پر امت کی تعمیری منصوبہ بندی کرے۔

ایسے افراد تو بہت ہیں، جو بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں۔ لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو کسی کے پاس حقیقی معنوں میں کوئی لائن آف ایکشن (line of action) نہیں۔ ان کے پاس جذباتی ردِّعمل ہوتا ہے، لیکن ان کے پاس ہوش مندی کے ساتھ کیا ہوا کوئی منصوبہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پوری امت کے لیے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ قرآن کی اس آیت کے مطابق عمل کریں: (ترجمہ) اے ایمان والو، تم سب مل کر اللہ کے سامنے توبہ کروتا کہ تم فلاح پاؤ (24:31)۔

میں اپنے الفاظ میں یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں غور کرنا چاہیے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے معاملے کی ری پلاننگ کریں۔ ری پلاننگ رسول اللہ کی ایک عظیم سنت ہے۔ اسلام کے دورِ اول کی بے مثال کامیابی اسی ری پلاننگ کا نتیجہ تھی۔ یہ ری پلاننگ مسلمانوں کی عام سوچ کے برعکس، ٹکراؤ کے میدان سے ہٹ کر تعمیری منصوبہ بندی کے میدان میں انرجی لگانے کی تھی۔ ہجرتِ مدینہ، اور صلحِ حدیبیہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اسی سنت کو سامنے رکھتے ہوئے، آج مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ ٹکراؤ اور ردِّعمل کے ماحول سے پیچھے ہٹ کر تعمیری عمل کی طرف متوجہ ہوں، نہ کہ بے فائدہ ٹکراؤ میں اپنی طاقت ضائع کرتے رہیں۔ حدیث میں ہے: آدمی کے محاسنِ اسلام میں سے ہے کہ وہ ایسے عمل سے دور رہے جو اس کے لیے بے نتیجہ ہو (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2317)۔

حق گوئی و بے با کی

آج کل بہت سے لوگ ایک لفظ بولتے ہیں، وہ ہے حق گوئی و بے با کی۔ بلا شبہ یہ ایک غیر مفید کام ہے۔ جو لوگ اس ٹائٹل کے ساتھ لکھتے اور بولتے ہیں، وہ علم اور علمی ذوق سے بالکل بے خبر ہیں۔

جس چیز کو حق گوئی و بے با کی کہا جاتا ہے وہ دراصل ری ایکشن (reaction) کا دوسرا نام ہے، اور ری ایکشن کا طریقہ صرف مسائل میں اضافہ کرتا ہے، نہ کہ مسائل کو کم کرتا ہے۔ عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس طرح کے بے با کانہ اظہارِ خیال کا کوئی فائدہ نہیں۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ صورتِ حال کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے مواقع کو دریافت کیا جائے، اور لوگوں کو بتایا جائے کہ مسائل کے باوجود کون سے مواقع موجود ہیں، جن کو اویل (avail) کرکے ترقی کا سفر جاری رکھا جاسکتا ہے۔

حق گوئی و بے با کی کے الفاظ اپنے سطحی رویے پر پردہ ڈالنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے، جو اعلیٰ ادب کی تخلیق نہیں کرسکتے۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں کو لکھیں، اور جو لوگ اس قسم کی چیزوں کو پڑھیں، وہ دونوں اپنے وقت کو ضائع کرنے والے لوگ ہیں، وہ جانتے نہیں کہ اعلیٰ ذوق کس چیز کا نام ہے۔ اس قسم کا ادب بلا شبہ احتجاج اور چیخ و پکار کے لیے وجود میں آتا ہے۔ یہ بلا شبہ وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ لکھنا نہ جانتے ہوں، ان کے لیے زیادہ بہتر کام یہ ہے کہ وہ دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں کے لیے دعا کریں۔ وہ خود اپنی شخصیت میں کمیوں کو دریافت کریں، اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

حق گوئی یہ ہے کہ آپ زیر بحث موضوع کا علمی مطالعہ کریں، اس سلسلے میں ٹھوس دلائل جمع کریں، اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ علمی ذوق کیا چیز ہے۔ اس کے بعد مثبت اسلوب میں مضامین لکھیں، جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ عام طور پر جس چیز کو حق گوئی و بے با کی کہا جاتا ہے، وہ ردعمل (reaction) ہوتا ہے، نہ کہ حق گوئی و بے با کی۔

ہجرتِ رسول

رسول اللہ کی بعثت 610 عیسوی میں ہوئی۔ تیرہ سال کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے آپ مدینہ گئے۔ یہ ہجرت پیغمبر اسلام کی ایک سنت ہے۔ اس سنت کو اگر لفظ بدل کر کہیں تو وہ طریقِ کار کی ری پلاننگ تھی۔ یعنی مقصد کے حصول کے لیے ناکام پلاننگ کوترک کر کے نئی پلاننگ کرنا۔ یہ پلاننگ اتنی کامیاب ہوئی کہ تھوڑی مدت کے بعد آپ کا مشن پورے عرب میں پھیل گیا۔ اپنے مشن کے لیے پہلی پلاننگ رسول اللہ نے مکہ کے حالات کو دیکھ کر کی تھی۔ لیکن مکہ کے حالات میں رسول اللہ نے جو پلاننگ کی تھی، وہ اہل قریش کی سخت مخالفت کا شکار ہوگئی۔ اس کے بعد آپ نے مدینہ کی بنیاد پر دوسری پلاننگ کی۔ اس دوسری پلاننگ کے بعد بھی بظاہر کچھ پرابلم پیش آئے۔ لیکن بہت جلد یہ پلاننگ کامیاب ثابت ہوئی، اور اسلام مختصر مدت میں فتح مبین (الفتح، 48:1) تک پہنچ گیا۔

جو لوگ آپ کے ساتھ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ پہنچے، عام طور پر ان کو مہاجر اور انصار کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم سیکولر زبان میں بات کریں تو وہ مہاجر اہلِ ایمان کا ڈائسپورا تھے، اور انصار وہ لوگ تھے جنھوں نے اس ڈائسپورا (diaspora) کی مدد کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے بڑے کارنامے ان لوگوں نے انجام دیے جو ڈائسپورا سے تعلق رکھتے تھے یا جنھوں نے ان کا ساتھ دیا۔ مثلاً، امریکا ان افراد کی محنت کا نتیجہ ہے جو ڈائسپورا تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تارکینِ وطن اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی نئے علاقے میں بستے ہیں، تو وہ اُن تکلفانہ سوچ سے آزاد ہوتے ہیں، جو سماجی روایات کے نام پر زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ نیا ماحول ان کے اندر ایک نیا جوش اور عزم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر کام پوری لگن کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں تک کہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اسلامی ہجرت کے بعد مدینہ میں پیش آیا۔ ہجرت کے بعد نئے مدینہ میں ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہوگئی، جو اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کے اندر نیا عزم وحوصلہ تھا۔ اس بنا پر یوں لگتا تھا کہ نیا مدینہ ہیروؤں کی بستی بن گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جو بستی پہلے سادہ طور پر یثرب تھی، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے آغاز کا سرچشمہ بن گئی۔

کامیابی کا درست طریقہ

ہر انسان کامیابی چاہتا ہے، مگر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا حصول درست طریقے سے ہونا چاہیے، نہ کہ غلط طریقے سے۔ اس سلسلے میں قرآن کا ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (2:168)۔ یعنی لوگو، زمین کی چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ رزق کے معاملے میں حلال کا طریقہ اختیار کرے۔ یہاں یہ رہنمائی محدود طور پر صرف کھانے پینے کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ اس میں روزمرہ کی زندگی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد ہے کہ وہ اپنے لیے کامیابی حاصل کرے، لیکن انسان کو وہی طریقہ (method) اختیار کرنا چاہیے جو حلال اور طیب ہو۔ وہ ہرگز ایسے طریقے کو اختیار نہ کرے جو اللہ کے قائم کردہ حدود کے مطابق غیر حلال اور غیر طیب ہو۔ اسی طرح، انسان کو اپنے ذہن میں ایسی سوچ کو جگہ نہیں دینی چاہیے جو غیر مزکّٰی ہو۔ مثلاً اگر ایک انسان کو یہ محسوس ہو کہ اُسے یا اُس کی قوم کو کسی دوسرے سے نقصان پہنچ رہا ہے، تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائے، تاکہ وہ عدل وتقویٰ کی حدود سے باہر نہ نکل جائے (المائدہ،5:8)۔

زندگی کی اس اہم حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (4:114)۔ یعنی، ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں۔ بھلائی والی سرگوشی صرف اس کی ہے جو صدقہ کرنے کو کہے یا کسی نیک کام کے لیے کہے یا لوگوں میں صلح کرانے کے لیے کہے۔ جو شخص اللہ کی خوشی کے لئے ایسا کرے تو ہم اس کو بڑا اجر عطا کریں گے۔

ضمیر یعنی سینسر

دورِ جدید کا ایک ظاہرہ یہ ہے کہ ہم آٹومیٹک سسٹم کے درمیان رہتے ہیں۔ یہ آٹومیٹک سسٹم سینسر کے ذریعہ کام کرتا ہے۔ جیسے ہماری موجودگی کا پتا لگا کر دروازہ کھولنا، دھواں یا آگ کا پتا لگا کر سائرن بجانا، گیراج کے دروازوں کو اس وقت کھولنا جب گاڑی دروازے کے قریب ہو۔ یہ سب اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے آٹومیٹک کام سینسروں کی وجہ سے ممکن ہوتے ہیں۔ آپ اپنے گھر، دفتر اور کاروبار وغیرہ میں مختلف قسم کے سینسرز کا استعمال کرسکتے ہیں جو ہماری زندگی کو آسان بنانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ سینسر کیا ہے۔ یہ ایک آلہ ہے، جو کسی جسمانی حرکت کو پہچان کر اس کے مطابق نتیجہ ظاہر کرتا ہے:

> A sensor is a device that detects changes in its environment and sends information about those changes to another device or system. A sensor is like a sense organ — just as your skin feels heat or cold, a sensor "feels" or senses things like temperature, light, movement, sound, or pressure.

انسانی جسم پر غور کیا جائے تو انسانی جسم میں بھی سینسرز لگے ہوئے ہیں، جو آپ کے جسم کے اندر اور باہر جاری ایک ایک حرکت کو محسوس کرکے اس کی خبر آپ کے دماغ تک پہنچاتے ہیں، جس بنا پر آپ ان کو جان پاتے ہیں۔ عرف عام میں ان کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

باصرہ (sight)، سامعہ (sound)، شامہ (smell)، ذائقہ (taste) اور لامسہ (touch)

اگر یہ حواس خمسہ نہ ہوں تو انسان کو بے شمار قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ ایک خاتون کا مجھے علم ہے۔ ان کی قوت شامہ (sense of smell) ختم ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان رہتی تھیں۔ کچن میں کھانا جل جائے یا کہیں آگ لگ جائے تو ان کو اس کا بالکل علم نہیں ہو پاتا تھا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں ایک اور سینسر رکھا ہے، یعنی اچھائی اور برائی کو پہچاننے کا سینسر۔ اس سینسر کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔ غالباً اسی ضمیر کو قرآن میں نفس لوامہ کہا گیا ہے (75:2)۔ ضمیر انسان کے لیے خدائی گائڈ ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو الارم دیتا ہے کہ وہ

کیا کرے، اور کیا نہ کرے۔لیکن یہ رہنمائی خاموش زبان میں ہوتی ہے۔ اگر آدمی بروقت اس آواز کو سن لے، تو وہ فوراً انسان کی رہنمائی کے لیے متحرک ہوجاتا ہے، لیکن اگر انسان فوراً متحرک نہ ہوتو وہ انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

دنیا کی زندگی میں بار بار آدمی کے اوپر غیر ربانی انٹرسٹ غالب آجاتا ہے، اور وہ اپنے ضمیر کے خلاف چلنے لگتا ہے۔ یہ روش ضمیر کو دھیرے دھیرے مردہ بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلے اور باز آجائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے۔ اور اگر دوبارہ گناہ کی طرف لوٹ آیا تو وہ سیاہی زیادہ ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سارے دل پر چڑھ جاتی ہے۔ یہی وہ (گناہ کا) زنگ ہے جس کا ذکر قرآن مجید (83:14) میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ہرگز نہیں بلکہ ان کے برے کاموں سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3334)

صحابیِ رسول حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ جب کوئی انسان گناہ کرتا ہے تو اس سے دل ہتھیلی کی مانند سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب وہ مزید گناہ کرتا ہے تو دل اور زیادہ سکڑ جاتا ہے یہاں تک کہ اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ پھر وہ خیر کی بات کو سنتا ہے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گناہ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ڈھیر بن جاتا ہے تو اس کے دل پر ایک بڑی مہر لگا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد انسان اگر خیر کا کلمہ بھی سنے تو وہ دل میں داخل نہیں ہو پاتا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 19181)

یہاں دل سے مراد وہی چیز ہے، جس کو اوپر ضمیر کہا گیا ہے۔ یعنی انسان کے اندر خیر وشر کو ڈیٹکٹ (detect) کرنے کی فطری صلاحیت۔ اس صلاحیت کو قرآن میں فرقان کی صلاحیت بھی کہا گیا ہے اور تقوی کو اس کا ذریعہ بتایا ہے (8:29)۔ ضمیر کسی آدمی کے اندر بصیرت پیدا کر دیتا ہے، جس سے وہ معاملے کے ظاہری پہلوؤں سے دھوکا کھائے بغیر ہر چیز کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکے۔ وہ مغالطوں میں پھنسے بغیر معاملے کی اصل حقیقت تک پہنچ جائے۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کو زندہ رکھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ خیر کو پہچانے اور اس کے مطابق عمل کر سکے، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ کسی خارجی سینسر کے ذریعہ اپنے مادی کام کو آسان بناتا ہے (ڈاکٹر فریدہ خانم)۔

جمعہ کا دن

جمعہ کا دن اسلام میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دن اسلام میں اجتماعی عبادت کا دن ہے۔ اس اجتماعی عبادت سے کئی مثبت پہلو وابستہ ہیں۔ مثلاً: (1) صفائی ستھرائی، اس دن ہر مسلمان صفائی ستھرائی کا زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ (2) وقت کی پابندی، کیوں کہ صبح سے ہی اگر اپنے اوقات کو منظم نہ کیا جائے تو مقرر وقت پر مسجد پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ (3) سماجی بھلائی، لوگ جب اپنے گھروں اور دفتروں سے نکل کر مسجد آتے ہیں تو راستہ میں وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ جمعہ کی نماز اجتماعی اوصاف کی تربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس دن تمام لوگ صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک امام کی پیروی میں نماز کے ارکان ادا کرتے ہیں۔ خاموش ہو کر خطبہ سنتے ہیں۔ یہ چیزیں ایک اعتبار سے عبادتی افعال ہیں۔ دوسرے اعتبار سے وہ اجتماعی اوصاف پیدا کرنے کی تربیت ہیں۔ وہ پوری قوم میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ سے انفرادی زندگی وسیع ہو کر اجتماعی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

جمعہ کا دن پورے ہفتے کے لیے ایک خصوصی تربیت کا دن ہے۔ جو خصوصیات جمعہ کے دن کی ہیں، اسلام یہ چاہتا ہے کہ اہلِ ایمان انھیں عام دنوں میں بھی مزید اضافہ کے ساتھ اختیار کریں۔ اس دن ہر آدمی کو صاف ستھرا رہنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیر خواہ بن کر رہنا سکھایا جاتا ہے۔ اس دن نظم وضبط کی تربیت دی جاتی ہے۔ اللہ کے ذکر سے آشنا کرایا جاتا ہے۔ اتحاد اور اجتماعیت کی مشق کرائی جاتی ہے۔ دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی صلاحیت ابھاری جاتی ہے، وغیرہ۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ جب نماز کے لیے لوگ مسجد میں جمع ہوں تو اس وقت کسی غیر متعلق مشغولیت کی طرف دھیان نہیں جانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار نماز کے دوران کچھ لوگ خرید وفروخت جیسے کاموں میں مشغول ہو گئے تو قرآن میں اس کے خلاف سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی، اور کہا گیا کہ نماز کے دوران ہر قسم کی غیر متعلق مشغولیت سے دور رہنا چاہیے۔

يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذا نُودِيَ لِلصَّلاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلى ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ☆ فَإِذا قُضِيَتِ الصَّلاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ☆ وَإِذا رَأَوْا تِجارَةً أَوْ لَهْواً انْفَضُّوا إِلَيْها وَتَرَكُوكَ قائِماً قُلْ ما عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجارَةِ وَاللهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (62:9-11)۔ یعنی، اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، کہو کہ جو اللہ کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے، اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

حدیث میں جمعہ کی نماز کے بارے میں آیا ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اگلی صف میں جانے کی کوشش کرے تو وہ بہت گناہ کا کام کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، تو آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ! تم لوگوں کو اذیت دے رہے ہو، حالاں کہ تم دیر سے آئے ہو (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1115)۔ اسی طرح اہل ایمان کو چاہیے کہ سماج میں رہتے ہوئے دوسرے پر ظلم کرکے اپنا فائدہ حاصل نہ کرے۔ اہلِ ایمان سماج میں نو پرابلم بن کر زندگی گزاریں، دوسرے کو ہرگز تکلیف نہ دیں۔

جمعہ کا دن ان چیزوں کو مشترک طور پر سیکھنے کا دن ہے جس کو دوسرے دنوں میں آدمی غیر مشترک طور پر سیکھتا ہے۔ جمعہ کا دن اس عمل کو مل کر کرنے کا دن ہے جس کو وہ دوسرے دنوں میں اکیلے اکیلے کرتا ہے۔ دوسرے دن اگر انفرادیت کے دن ہیں تو جمعہ کا دن اجتماعیت کا دن۔

جدید انسان کی تلاش

زیان فرانسس ریویل (Jean-Francois Revel, 1924-2006) کی کتاب مارکس یا مسیح کے بغیر (Without Marx or Jesus) فرانس میں 1970 میں شائع ہوئی۔ کتاب میں مصنف نے بوڈیلیٹر کا قول نقل کیا ہے جس نے تجویز کیا تھا کہ انسانی حقوق کے اعلان میں دو مزید حقوق شامل کیے جائیں۔ ایک، آپ اپنی تردید کرنے کا حق۔ دوسرے کنارہ کشی کا حق۔ امریکی نوجوان آج اسی انقلاب کی طرف جا رہا ہے۔ ایک طرف وہ ایک ایسے سماج کو رد کر رہا ہے جس کا محرک صرف منافع ہو اور جس پر صرف اقتصادی امور کا غلبہ ہو۔ دوسری طرف اسے روایتی مذاہب پر بھی اطمینان نہیں۔ کیوں کہ اس کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جسے آدمی خود دریافت کرے۔

امریکی نوجوانوں میں ابھرنے والے رجحانات کے چند نمایاں پہلو یہ ہیں: اخلاقی قدروں کی طرف واپسی کا رجحان، محض اقتصادی اور تکنیکی سماجی مقاصد کو رد کرنا، اور قدرتی ماحول کو تجارتی مفاد سے زیادہ اہمیت دینا۔ مصنف کے مطابق، ”آج امریکا میں ایک نیا انقلاب جنم لے رہا ہے، جو انسانیت کے لیے نجات کی راہ پیش کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مبنی بر ٹیکنالوجی تہذیب کو منزل سمجھنے کے بجائے اسے ایک ذریعہ کے طور پر لیا جائے۔ اور چونکہ نہ تو اس تہذیب کو مکمل طور پر ترک کرنا ہمارے لیے فائدہ مند ہے، اور نہ ہی اس کا جوں کا توں برقرار رکھنا مفید، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندروہ صلاحیت پیدا کریں جس سے ہم اس تہذیب کو مکمل طور پر ترک کرنے کے بجائے اسے ایک نئی اور بہتر صورت دے سکیں۔“

> Today in America a new revolution is rising. It is the revolution of our time. It is the only revolution that involves radical, moral, and practical opposition to the spirit of nationalism. It is the only revolution that, to that opposition, joins culture, economic and technological power, and a total affirmation of liberty

for all in place of archaic prohibitions. It, therefore offers the only possible escape for mankind today: the acceptance of technological civilization as a means and not as an end, and—since we cannot be saved either by the destruction of the civilization or by its continuation—the development of the ability to reshape that civilization without annihilating it. (p. 242)

یہ ذہن جس کی نمائندگی اس کتاب میں کی گئی ہے ایک ایسے آدمی کی بے چینی کی طرح ہے جسے خود اپنی بے چینی کا سبب معلوم نہ ہو۔ امریکی نوجوان مادی تہذیب سے، جس کی آخری نمائندگی مارکس نے کی، مکمل طور پر غیر مطمئن ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ اس ''ماضی'' کو دیکھنے لگا ہے جس کو اس کے باپ دادا نے چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہاں ''ماضی'' کی نمائندگی کرنے والی جو چیز ملتی ہے وہ عیسائیت ہے۔

عیسائیت اپنے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ خالص علمی وعقلی ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ اس لیے وہ ''مارکس'' کے ساتھ ''مسیح'' کا بھی باغی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغاوت کے بعد وہ جس چیز کا طالب ہے، وہ اس کے اپنے الفاظ میں وہی چیز ہے جس کا جواب صرف مذہب کے اندر ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مجہول احساس کے ساتھ اسی چیز کی تلاش میں ہے جس کو مذہب کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کا نام ''نہ مارکس نہ مسیح'' رکھا ہے۔ مگر باعتبارِ حقیقت اس کا نام ہونا چاہیے تھا ''نہ مارکس نہ مروجہ عیسائیت''۔

میڈالین ایم اوہیئر (Madalyn Murray O'Hair, 1919-1995) امریکہ کی مشہور ترین ملحد خاتون ہیں۔ وہ کھلم کھلا اپنے الحاد کی تبلیغ کرتی ہیں۔ پکے خدا پرست والدین کی یہ بیٹی اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''مجھے ان کے اعتقادات کا علم تھا اور احترام بھی کرتی تھی۔ مگر 13 سال کی عمر میں اتوار کا پورا دن انجیل پڑھتے رہنے کے بعد میں اس کی یکسر خلافِ عقل باتوں سے متنفر ہو گئی۔''

انسان مذہب کی طرف لوٹنا چاہتا ہے مگر مذہب کی غلط نمائندگی اس کو دوبارہ مذہب سے دور لے جا رہی ہے۔ یہ ہے دورِ جدید کا سب سے بڑا المیہ۔

ذکراللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے ایک صحابی معاذ بن جبل کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: اذْکُرِ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ عِنْدَ کُلِّ حَجَرٍ وَعِنْدَ کُلِّ شَجَرٍ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 374)۔یعنی اللہ رب العالمین کو یاد کرو، ہر پتھر کے پاس اور ہر درخت کے پاس۔

اس حدیث میں پتھر اور درخت کا ذکر بطور تمثیل ہے۔اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز میں خالق کی نشانی ہے، اس کے ذریعہ خالق کی دریافت کرو، اور اس کی معرفت حاصل کرو۔ یہاں ذکرُ اللہ سے مراد اللہ کا لفظی ورد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد اللہ کی شعوری یاد (conscious remembrance of God) ہے۔ یہ یادشعوری انداز میں ہر وقت مطلوب ہے۔ یہ شعوری یاد کسی قسم کے روٹین کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اعلیٰ حقیقت کی دریافت کے نتیجے میں ذہن انسانی میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک زندہ اور تخلیقی سوچ ہے۔

اعلیٰ ذکر کسی انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کہ وہ گہرے غور وفکر کے ذریعہ اللہ رب العالمین کو دریافت کرے۔ یہ دریافت اتنی کامل ہو کہ وہ اس کی سوچ پر غالب آجائے، اس کی شخصیت اسی دریافت میں ڈھل جائے۔ وہ اس کے صبح وشام کا ناگزیر اثاثہ بن جائے۔

جدید سائنسی ڈسکوری نے بذریعہ تخلیق خالق کی دریافت کو بے انتہا حد تک وسیع کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ کا مقصد صرف ٹیکنکل ترقی نہیں ہے۔اس سے بڑھ کر اس کا ایک اور مقصد ہے، اور وہ ہے تخلیقات میں خالق کو دریافت کرنا۔تخلیقات کا گہرا مطالعہ کرکے زندگی کے راز کو معلوم کرنا۔ مادی کائنات کی تحقیق کرکے یہ جاننا کہ اس کے نقشہ کے مطابق، انسانی ترقی کا قانون کیا ہے۔ چنانچہ انسان جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس میں ایک طرف خالق کی تجلیات کو پالیتا ہے اور دوسری طرف اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی کامیاب تعمیر کن خطوط پر کرنا چاہیے۔(ڈاکٹر فریدہ خانم)

ایک انٹرویو

سوال: مولانا، بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے اندر قومیتوں کے تضادات آخر کار اس کو ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار کردیں گے۔ آپ کا اس تجزیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: تضادات تو ہر سوسائٹی میں ہوتے ہیں۔ بے تضاد سوسائٹی کوئی بنی نہیں۔ مسلم سوسائٹی بھی تضادات سے پاک نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روس کی طرح ہندوستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، وہ مغالطے میں مبتلا ہیں۔ روس کے ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عوام کو بے روٹی کردیا۔ میں خود روس گیا ہوں۔ عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ روس نے اپنے سارے وسائل اسلحہ سازی پر لگا دیے اور عوام کو بے روٹی کردیا۔ لیکن انڈیا میں ایسا نہیں ہوا کہ حکومت نے عوام کی روٹی چھین لی ہو۔ اگر آپ عوام سے روٹی چھین لیں گے تو پھر بغاوت ہوگی۔ اسلامی حکومت ایسا کرے گی تو اس کے خلاف بھی بغاوت ہوگی۔ انڈیا میں لوگوں کو آزادی ہے۔ ان کے پاس کھیت ہیں، وہ پیدا کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ وہاں بغاوت کس طرح ہوگی؟ باقی جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ جھگڑے تو ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

سوال: بابری مسجد کے حوالے سے آپ کی رائے عام علما سے مختلف رہی۔ وہاں کے کئی علما کو آپ سے شکایت بھی ہے کہ آپ ان کے موقف کی طرف داری نہیں کرتے؟

جواب: بابری مسجد کے بارے میں میری رائے عام مسلمانوں کی رائے سے مختلف نہیں۔ میں اس الزام کی تردید کرتا ہوں۔ میرا اختلاف صرف تدبیر کا اختلاف ہے۔ ان کا خیال تھا کہ معاملہ کو سڑکوں پر لایا جائے۔ یہ سڑکوں پر حل ہوگا، جلوس سے حل ہوگا، جلسوں سے حل ہوگا، گولی سے حل ہوگا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان طریقوں سے نہیں، بلکہ پر امن طریقے سے حل ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ آخر کار ان کو ناکامی ہوئی۔

سوال: کیا یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بن جائے وہاں قیامت تک کوئی اور تعمیر نہیں ہوسکتی؟

جواب: ہماری فقہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

سوال: قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ کیا ہے؟

جواب: بس اتنا ہی کافی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

سوال: بعض حضرات نے قومی اور اصلی اسلام کے خانے بنا رکھے ہیں۔ اور ان کے نزدیک قومی خدمت، اسلامی خدمت قرار نہیں دی جاسکتی۔ کیا مسلمانوں کے قومی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا غیر اسلامی ہے؟

جواب: بالکل اسلامی ہے۔ صرف یہ ہے کہ تقسیم کار ہونی چاہیے۔ کچھ لوگ مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانے کی کوشش کریں، کچھ فکری چیلنجوں کا مقابلہ کریں، کچھ مسلمانوں کو انڈسٹری میں ترقی دیں۔ یہ عین اسلامی کام ہوگا۔ میں صرف ایک چیز کا مخالف ہوں، حکومتوں سے ٹکراؤ۔ اس کو میں زہر سمجھتا ہوں کیونکہ یہ سارے کام بگاڑ دیتا ہے۔

سوال: امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے آپ کے خوشگوار مراسم یک بیک ناخوشگوار کیوں کر ہو گئے؟ اب سنا ہے کہ ترک ملاقات تک نوبت آن پہنچی ہے۔ حالانکہ چند سال قبل انھوں نے محاضرات قرآنی میں آپ کو خاص طور پر مدعو کیا تھا؟

جواب: ڈاکٹر صاحب مجھ سے کیوں ناراض ہیں، یہ ان کو معلوم ہوگا۔ میں نے تو ”الرسالہ“ میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف کبھی کچھ نہیں لکھا اور میں ان کے کام کی قدر کرتا ہوں، جو کچھ بھی ہے۔ لیکن اختلاف اپنی جگہ، وہ جس اسلامی انقلاب کا ذکر کرتے ہیں اور جو بیعت انھوں نے اپنے پیروکاروں سے لے رکھی ہے، میں اسے صحیح نہیں سمجھتا۔

سوال: پاکستان میں ان دنوں علما کا ایک طبقہ جمہوریت کو ترک کر کے خلافت کا علمبردار بن گیا ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ فورم بنا دیے گئے ہیں۔ کیا اسلام میں جمہوریت مبغوض ہے؟ اور یہ کہ جمہوریت اور خلافت میں کیا حقیقی فرق ہے؟

جواب: دیکھیے، جمہوریت نام ہے ایک حکومتی نظام کا۔ میں اس کو اسلام کے مطابق سمجھتا ہوں

اور خلافت بھی عین جمہوری ہے۔ اس کو چھوڑ دیجیے کہ جمہوری نمائندے قانون سازی بھی کرتے ہیں، وہاں تک نہ جائیے۔ لیکن یہ کہ افرادِ حکومت کس طرح منتخب ہوں، جمہوریت اس کا نام ہے۔ اسلام کا نظامِ خلافت عین جمہوری تھا۔ یہ بے کار بحثیں ہیں اور یہ ان لوگوں نے شروع کر رکھی ہیں جنھوں نے نظام کو نشانہ بنا رکھا ہے اور فرد سازی کے کام کو عملاً ترک کر دیا ہے۔

سوال: آپ نے مولانا مودودی مرحوم کی فکر پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں دین کے اصل محور کو بدل دیا گیا ہے۔ اور سیاست جو کہ دین کا ایک تقاضا ہے اسے کل دین قرار دے دیا گیا۔ آپ نے اس کو "تعبیر کی غلطی" قرار دیا اور ایک متوازن فکر پیش کرنے کا دعویٰ کیا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ردعمل میں آپ نے ایک دوسری انتہا کو چھو لیا اور دین کی ایک ایسی تعبیر کر ڈالی جس کو قبول کر لینے کے بعد ایک مسلمان امورِ مملکت یا امورِ سیاست میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

جواب: جن لوگوں نے مجھ پر یہ اعتراض کیا ہے، ان کو چاہیے کہ وہ اپنے دلائل بھی دیں۔ یہ ایک مجرد بیان ہے کہ میں ایک دوسری انتہا تک پہنچ گیا ہوں۔ میں نے ایک فکر پر اعتراض کیا، اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے دلائل دیے اور اس کے متوازی ایک دوسرا فکر پیش کیا۔ اب میرے فکر کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں جو صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں، لیکن انھوں نے کوئی دلیل تو دی نہیں۔ بس ایک بیان دے دیا ہے۔ اب ان کے بیان پر کیا بیان دیا جائے۔

سوال: مولانا، بعض لوگ آپ پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں۔ یہ کہ کرنل معمر قذافی آپ کی مالی امداد کرتے ہیں، یہ کہ حکومت بھارت آپ کی سرپرستی کرتی ہے، یہ کہ آپ کا "الرسالہ" حکومت ہزاروں کی تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کرتی ہے؟

جواب: یہ صد فیصد جھوٹ ہے۔ آپ جس سطح پر بھی جانچ کر لیں۔ آپ چاہیں تو میرے اکاؤنٹ کو چیک کر لیں، میرے پاس جو کچھ ہے Accounted Money ہے۔ جس کا باقاعدہ آڈٹ کیا جاتا ہے۔ حسابات میں لکھا ہوا ہے کہ میں نے مکان کہاں سے خریدا اور گاڑی کیسے خریدی۔ آپ نے لیبیا کی بات کی ہے۔ کیا "الرسالہ" میں قذافی کی تبلیغ ہوتی ہے؟ قذافی لیبیا کا ڈکٹیٹر ہے اور میں صبر

اوراعراض کی بات کرتا ہوں۔ کیا قذافی مجھے اس لیے پیسہ دے گا کہ میں اس کے الٹ تبلیغ کروں؟ اگر کوئی میری اس دلیل سے مطمئن نہ ہو تو میں مباہلہ کے لیے تیار ہوں۔ جن صاحب کو اعتراض ہے، وہ مسجد میں میرے ساتھ آ جائیں۔ میں یہ کہنے کے لیے تیار ہوں جس شخص نے قذافی سے پیسہ لیا، اس پر اللہ کی لعنت ہو، وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوجائے، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نہ ملے، حوض کوثر پر حضور اس کو پانی نہ پلائیں۔ میں بھی یہ کہتا ہوں اور وہ صاحب بھی یہ کہیں۔

ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ میں وہاں کانفرنسوں میں جاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک عرب نے یہی اعتراض کیا تو میں نے ان کو وہ تقریریں دکھا دیں جو میں نے وہاں کی تھیں، چونکہ کانفرنسوں کے بعد ایسی تقریریں شائع کردی جاتی ہیں۔ ان تقریروں میں میرا موضوع وہی ہوتا ہے جس کا "الرسالہ" میں ذکر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی ثابت کردے کہ میں نے کبھی قذافی کی تعریف کی ہو یا اس کے حق میں تقریر کی ہو؟

سوال: اور انڈیا کی سرپرستی کا معاملہ کیا ہے؟

جواب: یہ بھی جھوٹ ہے۔ کوئی ثابت کرے کہ حکومتِ بھارت میرا پرچہ اس طرح خریدتی ہے۔ میں انڈیا میں رہتا ہوں، لیکن میں آج تک حکومت کے کسی آدمی سے ملاقات کرنے نہیں گیا۔ کسی گورنر، وزیر، صدر کو نہیں ملا۔ حالانکہ ان سے ملاقات میرے لیے مشکل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت کے لوگ میرا پرچہ پڑھتے ہیں، جس طرح دوسرے پرچے پڑھتے ہیں۔ لیکن حکومت سے میرا کوئی تعلق نہیں اور نہ میں نے حکومت سے کوئی پیسہ لیا ہے۔ اگر کوئی یہ ثابت کردے تو میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ میں اپنے مرکز کو آگ لگا دوں گا۔ جی ہاں، اگر کوئی یہ ثابت کردے کہ میں حکومت سے امداد لیتا ہوں تو میں اپنے مرکز کو خود آگ لگا دوں گا۔ اس کے لیے بھی میں مباہلہ کو تیار ہوں۔

سوال: آپ کی کوٹھی، کار کا ذکر بھی ہوتا رہتا ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے عرض کیا، میرے پاس Accounted Money ہے۔ میرے اکاؤنٹ کا آڈٹ بھی وہی صاحب کرتے ہیں جو جماعت اسلامی کے آڈیٹر ہیں، مقصود عالم صاحب۔ وہ میرے اور جماعت اسلامی ہند کے حسابات دیکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آڈیٹر کو سب معلوم ہوتا ہے۔ جن کو شبہ ہے ان صاحب سے معلوم کرلے۔ (بشکریہ: زندگی، لاہور، ستمبر 1991)

ڈائری 1986

26 جون 1986

بنگلور میں 26 جون سے 30 جون 1986 تک ایک بین المذاہب کانفرنس تھی۔ اس کا دعوت نامہ مجھے ملا تھا اور میں نے اس کا مقالہ بھی تیار کرلیا تھا۔ کانفرنس والوں کی طرف سے ٹکٹ بھی آ گیا تھا۔ مگر بعد کو میں نے بنگلور جانے کا ارادہ بالکل ختم کر دیا۔ مگر کانفرنس کے دو دن پہلے ڈاکٹر راجندر ورما میرے دفتر میں آئے۔ کانفرنس کے حکام کے مطابق میں ان کا رسپانڈنٹ (respondent) بنایا گیا ہوں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور بنگلور چلیں۔ چنانچہ ان کے اصرار کی بنا پر میں راضی ہو گیا۔ آج صبح کی فلائٹ سے بنگلور جا رہا ہوں۔

اس درمیان کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ 29 جون کو اسلامی مرکز کا ماہانہ اجتماع تھا۔ حسبِ معمول لوگ آئے۔ مگر میں اس وقت بنگلور میں تھا۔ اجتماع میں میرا ایک ٹیپ بنایا گیا۔ بنگلور سے 30 جون کی شام کو واپس آیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ دو موٹے موٹے مشتبہ قسم کے آدمی اجتماع میں آئے تھے۔ وہ مجھ کو پوچھتے رہے۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ میں دہلی میں نہیں ہوں تو وہ واپس چلے گئے۔

آج کل کچھ لوگ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ شاید وہ مجھے قتل کرا دینا چاہتے ہیں۔ شبہ ہے کہ مذکورہ آدمی انہیں کی طرف سے کرایہ پر بھیجے گئے تھے۔ یہی لوگ دوبارہ 2 جولائی کو آئے۔ اس بار وہ تین آدمی تھے۔ دفتر والوں نے کہہ دیا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ ملاقات کے لیے اصرار کرتے رہے۔ بڑی مشکل سے وہ واپس گئے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

27 جون 1986

اَسّی (80) کی دہائی میں میرے ساتھ مادی نقصانات کے کچھ واقعات پیش آئے۔ ایک نقصان پر ہمارے ایک ساتھی نے مجھے یہ خط لکھ کر کہا کہ ان کو شریکِ مشورہ نہیں کیا گیا، ورنہ اس کی نوبت نہ آتی۔ وہ اپنے خط مورخہ 17 جون 1986 میں لکھتے ہیں:

”اس کا نقصان یہ سامنے آیا کہ اگر آپ نے مجھے ٹھیک سے سمجھا ہوتا تو شاید کئی مواقع پر میرا زیادہ

مفید استعمال کر سکتے تھے۔ اگر آپ مجھے اس مسئلہ میں شروع سے دخیل فرما دیتے تو میرے خیال سے نوعیت ہی اس وقت کچھ اور ہوتی۔“

عجیب بات ہے کہ ان معاملات میں میرے سوچنے کا انداز اس سے سراسر مختلف ہے، جو ہمارے مذکورہ ساتھی کے خط میں نظر آتا ہے۔ یہ واقعات بلاشبہ ضیاع کے واقعات تھے۔ مگر ان کے ذریعہ مجھے ایک بہت بڑی دریافت ہوئی۔ ان واقعات نے مجھے ایک ایسی حقیقت کو سمجھنے میں مدد دی، جو اس سے پہلے شعوری طور پر مجھ پر واضح نہ تھی۔

ان واقعات پر غور کرنے کے بعد میں نے جانا کہ اگر مجھے اصل واقعہ سے کچھ پہلے معلوم ہو گیا ہوتا کہ میرے مخالفین اس معاملہ میں کیا سوچ رہے ہیں تو میں بروقت اقدام کر کے یقینی طور پر اس کا دفعیہ کر سکتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آبائی زمین یا مرکز کی ایک عمارت کے بارے میں کوئی شخص قبضہ کا منصوبہ بنا رہا ہے تو میں اس کو پہلے ہی فروخت کر دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجربہ کے بعد ہی میری سمجھ میں وہ آیت آئی جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ (7:188)۔

یعنی، اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں فائدہ حاصل کرنے کا خاص مدار اس پر ہے کہ آدمی غیب کو جانتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئیں، اس کا خاص الخاص راز یہی تھا۔ سیرت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار اپنے پیغمبر کو مخالفین کی خفیہ تدبیروں سے باخبر کرتا رہا۔ اس طرح آپ ان کے اقدام سے پہلے ان کے منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور پیشگی کارروائی کر کے ان کے خفیہ منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔

مذکورہ ساتھی ایک مخلص آدمی ہیں۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ادراک ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے کہ وہ ہمارے مشن کی آزادانہ رہنمائی کر سکیں۔ اس کی ایک مثال ان کا مذکورہ بالا خط ہے۔

یہ سطریں لکھتے ہوئے مذکورہ ساتھی کو شاید سورہ آل عمران کی وہ آیتیں یاد نہ تھیں جو غزوۂ احد سے

متعلق ہیں۔قصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ قریش مکہ آپ سے لڑنے کے لئے آرہے ہیں تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔صحابہ کی جماعت کی رائے یہ ہوئی کہ مدینہ سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔مگر عبد اللہ بن ابی کی رائے شدت سے یہ تھی کہ ہم لوگ مدینہ میں لڑیں۔جب قریش کا لشکر یہاں تک پہنچ جائے تو ہم اپنے گھروں کی آڑ لے کر ان کا مقابلہ کریں۔مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کی رائے کے خلاف دوسرے صحابہ کی رائے پر عمل کیا اور آگے بڑھ کر احد کے مقام پر دشمن کی فوج کا مقابلہ کیا۔جیسا کہ معلوم ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔

جنگ کے بعد عبد اللہ بن ابی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ پیغمبر نے ہماری رائے نہیں مانی اس لیے شکست ہوئی۔اگر پیغمبر ہماری بات مان لیتے تو ہم اپنی بستی میں رہ کر مقابلہ کرتے اور ایسا نہ ہوتا کہ باہر احد کی وادی میں ہمارے نوجوان قتل کردیے جائیں۔اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے اور تم پر موت لکھی ہوئی ہوتی تو جہاں تم تھے وہیں مارے جاتے:

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ (3:154)۔یعنی، کہو، سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔وہ اپنے دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملہ میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔کہو، اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا لکھ دیا گیا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل پڑتے۔

میں مذکورہ ساتھی کی عزت کرتا ہوں اور دل سے ان کے اخلاص کا قائل ہوں۔مگر میری سوچ میں اور ان کی سوچ میں بہت زیادہ فرق ہے۔

مرکز کی ایک عمارت کے واقعہ پر ان کا کہنا ہے کہ اگر ان کو اس معاملہ میں شریکِ مشورہ کیا جاتا تو وہاں کی بلڈنگ کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا۔جب کہ میری سوچ یہ ہے کہ اس معاملہ میں مجھے اس لیے نقصان اٹھانا پڑا کہ مجھے علم غیب حاصل نہیں۔

ایک ہی واقعہ ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس میں ایک شخص نے خدا کو پایا اور دوسرے شخص نے اپنے آپ کو۔

یکم جولائی 1986

کیلی گولا (Caligula) چوتھا رومی شہنشاہ تھا۔ اس نے 37ء سے لے کر 41ء تک حکومت کی۔ مورخین عام طور پر اس کی بری تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس نے بہت سے لوگوں کا قتل کرا دیا۔ اس نے عجیب عجیب احکامات نافذ کئے۔ حتیٰ کہ کچھ مورخین اس کو پاگل کہتے ہیں۔ اگرچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ اس کے پاگل پن کی اکثر شہادتیں غیر ثابت شدہ ہیں:

Much of the evidence of his alleged madness has been disproved. (vol. II, p. 459)

آخر کار ایک فوجی افسر نے اس کو قتل کر دیا۔

کیلی گولا کے عجیب عجیب کاموں میں سے ایک یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک بار اپنے تمام لوگوں سے بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ تم سب کے سب نالائق ہو اور تم سے کہیں زیادہ بہتر یہ میرا گھوڑا ہے۔ اس کا ایک گھوڑا تھا، جس کا نام انسی ٹیٹس (Incitatus) تھا۔ اس نے اپنے اس گھوڑے کو روم کا گورنر بنا دیا۔

کیلی گولا سوار اور سواری میں فرق نہ کر سکا۔ ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ گھوڑا سواری کرنے کے لیے بلاشبہ سمجھدار ہے، مگر وہ سوار بننے کے لیے سمجھدار نہیں۔

یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ کچھ لوگ مدرس یا مقرر کی حیثیت سے لائق ہو سکتے ہیں، لیکن اگر ان کو قوم کا قائد بنا دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس دوسرے میدان میں وہ اتنے ہی نااہل ثابت ہوں، جتنا وہ درس اور تقریر کے میدان میں اہل نظر آ رہے ہیں۔

2 جولائی 1986

قرآن کی تفسیر حدیث سے کرنا بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب ایک مفسر کسی آیت کے ذیل میں ایک حدیث نقل کر دے تو اس کا مطلب لازماً یہ ہو جائے گا کہ حدیث کے مطابق اس آیت کی تفسیر یہی ہے۔ کیونکہ ایسی حدیثیں بہت کم ہیں جو براہ راست طور پر کسی آیت کی

تفسیر میں آئی ہوں۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ مفسر اپنے خیال کے مطابق آیت کا ایک مفہوم سمجھتا ہے اور اس کے مطابق حدیثیں اس کے ذیل میں نقل کردیتا ہے۔

مثلاً سورہ مزمل کی ایک آیت ہے: إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (73:5)۔ یعنی، ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ اس آیت میں قول ثقیل کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر نے وہ حدیثیں نقل کردی ہیں جن کا تعلق نزول وحی کی کیفیت سے ہے۔ مثلاً صحیح البخاری کی دوسری حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تو وہ آپ پر سخت بوجھ پڑتا۔ حتیٰ کہ سردی کے زمانہ میں بھی آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگتا (وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا) تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 406۔

نزول وحی کی یہ کیفیت بذات خود صحیح ہے اور وہ روایات سے ثابت ہے۔ مگر سورہ مزمل کی مذکورہ آیت کا تعلق اس سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں قول ثقیل سے مراد وہ شہادت علی الناس کی ذمہ داری ہے جو اگلی سورہ (المدثر) میں ان الفاظ میں مذکور ہے: قُمْ فَأَنْذِرْ (74:2)۔ یعنی، اٹھ اور لوگوں کو آگاہ کر۔ خدائی پیغام سے لوگوں کو آگاہ کرنا بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اسی لیے اس کو قول ثقیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

3 جولائی 1986

ایک صاحب نے اپنے ایک رشتہ دار کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ بہت بہادر ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ پرانی دہلی کی کسی سڑک پر کھڑے تھے کہ ان کے پاس سے ایک سائیکل سوار گزرا۔ اس کی سائیکل سے کیچڑ اڑ کر مذکورہ صاحب کے کپڑے پر آگیا۔ انھوں نے سائیکل والے کو روکا، ابھی وہ اس سے بات ہی کررہے تھے کہ مذکورہ رشتہ دار نے ”اس کو ایک ہاتھ لگادیا“۔

مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ مذکورہ رشتہ دار صاحبِ اولاد نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں ان کی شادی ہوئی، اور بچے ہوئے، تو مذکورہ صاحب کے الفاظ میں، ”اب ان کے بچوں نے ان کو بزدل بنادیا“۔ بچوں کے بعد کا واقعہ ہے، محلہ کے ایک شخص نے مذکورہ رشتہ دار سے بدتمیزی کی۔

مگر وہ کچھ نہ بولے، بالکل خاموشی کے ساتھ اپنے گھر چلے گئے۔ ان کا یہ رویہ ان کے سابقہ رویہ کے سراسر خلاف تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس بدتمیزی کو تم نے کیسے برداشت کیا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر۔ میرے بچوں نے مجھ کو برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ میرے بچے گھر کے باہر سڑک پر نکلتے ہیں۔ میں ہر وقت ان کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ شخص محلہ ہی کا آدمی ہے۔ اس کا غصہ اگر بڑھ گیا تو وہ میرے بچوں کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ رشتہ دار بہت بہادر آدمی تھا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ بات بات میں لڑ جاتا تھا۔ مگر جب اس کی شادی ہوئی اور اس کے یہاں بچے پیدا ہو گئے تو بچوں کی محبت نے اس کا مزاج بدل دیا۔

مذکورہ رشتہ دار کے اندر یہ خوبی ممکنہ طور پر اس کے بچوں کو پہنچنے والے نقصان کے اندیشہ نے پیدا کی۔ یہ وہ خوبی ہے جو درد کی درس گاہ میں سکھائی جاتی ہے۔ اگر آپ کے اندر درد نہ ہو تو آپ اس معاملہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے ملی قائدین صبر اور اعراض کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر قوم کا درد نہیں ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر ہر آدمی بزدل بنا ہوا ہے۔ مگر قوم کے بچوں کی خاطر کوئی شخص بزدل بننے کے لیے تیار نہیں۔

4 جولائی 1986

مسز اینا کھنہ (Anna Khanna) ایک انگریز خاتون ہیں۔ انگلینڈ میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات مسٹر پریم کھنہ سے ہوئی، جو مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے تھے۔ وہ آئی اے ایس ہیں۔ بعد کو دونوں نے شادی کرلی اور اب مسز اینا کھنہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دہلی میں رہتی ہیں۔

مسز کھنہ اگرچہ ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ مگر عیسائیت پر یا مذہب پر ان کا کوئی عقیدہ نہ تھا۔ وہ کبھی چرچ نہیں جاتی تھیں۔ وہ پورے معنوں میں سیکولر تھیں۔

فروری 1984 میں انگریزی الرسالہ نکلا تو ہم لوگوں کا ربط ان سے قائم ہوا۔ میری لڑکی فریدہ اپنے ترجمہ کیے ہوئے انگریزی مضامین کی نظر ثانی ان سے کراتی تھی۔ شروع کے دو سال اس طرح گزرے کہ وہ اکثر خدا اور مذہب کی باتوں پر فریدہ سے بحث کرتیں۔ بعض مضامین جن میں خدا کو

خیر مطلق کے طور پر پیش کیا گیا تھا، ان کو دیکھ کر وہ بگڑ گئیں۔ حتیٰ کہ اندیشہ ہوا کہ شاید وہ نظر ثانی کا کام ہی چھوڑ دیں۔ تاہم کام جاری رہا اور ان کے کہنے کے مطابق معاوضہ کی شرح بھی بڑھاتی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ تیسرا سال آ گیا۔ اور فریدہ نے مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ترجمہ کر کے انھیں نظر ثانی کرنے کے لیے دیا۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ان کے ذہن میں واضح طور پر فرق محسوس ہو رہا ہے۔ اب نہ صرف یہ کہ ان کی شدت ختم ہو گئی ہے، بلکہ خدا پر ان کا عقیدہ بحال ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہمارے کاموں کے لیے sympathetic ہو گئی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مسلسل کام کیا جائے تو سخت سے سخت آدمی کو بھی متاثر کیا جا سکتا ہے۔

••••••••••••••••••••••••••••••••

ایک سوال

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِنْ أُولَئِكُمْ أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ (54:43)۔ یعنی، کیا تمہارے منکر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی کتابوں میں معافی لکھ دی گئی ہے۔ اس میں کس چیز کی براءۃ کی طرف اشارہ ہے۔ (حافظ سید اقبال احمد عمری، تامل ناڈو)

جواب

قرآن کی اس آیت میں وقتی ریفرنس کے اعتبار سے قدیم مکہ کے قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے۔ مگر ابدی اصول کے اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی گروہ مستثنیٰ گروہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہر ایک کا معاملہ یکساں ہے۔ یعنی ہر ایک کو ایک ہی معیار پر جانچا جائے گا۔ ہر ایک سے ایک ہی اصول کی روشنی میں معاملہ کیا جائے گا۔ نہ پیدائشی اعتبار سے کسی کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے، اور نہ ایسا ہے کہ قرآن کے سوا جو دوسری آسمانی کتابیں اللہ نے اتاری ہیں، ان میں کسی گروہ کے بارے میں یہ اعلان ہے کہ ان کا کیس ایک مستثنیٰ کیس ہے۔ وہ بھی خدا کے مواخذہ کے قانون کے تحت ہیں، جس طرح دوسرے تمام لوگ ہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 285

● مزشبینہ علی اور کولکاتا ٹیم کے چند دیگر افراد نے 20 تا 22 فروری 2025ء کو منعقدہ تین روزہ انٹرفیتھ ورکشاپ میں شرکت کی۔ اس موقع پر انہوں نے امن اور روحانیت کے موضوع پر حاضرین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے آخر میں مزشبینہ علی اور ان کی ٹیم نے تمام شرکا کو امن اور روحانیت سے متعلق کتابیں بطورِ تحفہ پیش کیں۔

● تمل ناڈو سے مولانا اسرار الحسن عمری صاحب لکھتے ہیں کہ جناب شیو کمار (Sivakumar, b. 1952) انگریزی زبان کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ تمل زبان پر بھی انہیں عبور حاصل ہے، اور وہ کئی مشہور انگریزی کتابوں کے مترجم بھی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے سلمان رشدی کی کتاب Knife (مطبوعہ اپریل 2024) کا تمل زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب 12 اکتوبر 2022 کو سلمان رشدی پر کیے گئے قاتلانہ حملے کے بعد اس کے احساسات وخیالات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے تمل ترجمے کا اجرا چنئی بک فیر (27 دسمبر 2024 تا 12 جنوری 2025) میں ناشرِ کتاب کے اسٹال پر 8 جنوری 2025 کو عمل میں آیا۔ یہ اجرا بلاشبہ حاضرین کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ اس موقع پر مولانا اقبال احمد عمری صاحب نے شرکت فرمائی۔

پروگرام کے بعد مولانا اقبال عمری صاحب نے مترجم، ناشر اور دیگر اہم شخصیات کی خدمت میں مولانا وحید الدین خاں کی کتاب شتمِ رسول کا انگریزی ترجمہ (The Issue of Blasphemy) بطور تحفہ پیش کیا۔ بعد میں محسوس ہوا گویا یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ ایک خدائی انتظام کا حصہ تھا۔ شیو کمار صاحب نے نہ صرف دو تین دن میں یہ کتاب مکمل کرلی، بلکہ ایک ہفتے بعد فون کرکے بتایا: ”واقعی، یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے اور نہایت اہم علمی مباحث پر مشتمل ہے۔“ اسی کے ساتھ انہوں نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔

17 جنوری 2025 کی صبح 11 بجے ہم ان کے گھر پہنچے۔ انہوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے ان کی خدمت میں مولانا کی مزید چند کتابیں بھی پیش کیں، جن میں God Arises بھی شامل تھی۔ رسمی گفتگو کے بعد، The Issue of Blasphemy پر تبصرہ کرتے ہوئے شیو کمار صاحب نے کہا: ”یہ کتاب واقعی بہت اچھی ہے۔ عام طور پر میرا بھی یہی خیال تھا کہ تمام مسلمان ایک ہی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں، اور ان کے ہاں برداشت کی کمی ہوتی ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادی کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں اس کے برعکس سوچ رکھنے والے رہنما بھی موجود ہیں، جو وقتاً فوقتاً اپنی قوم کی صحیح رہنمائی کرتے آئے ہیں۔“

اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اسرار الحسن عمری صاحب نے مولانا وحید الدین خاں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جب سلمان رشدی کے خلاف فتویٰ جاری ہوا، تو اس وقت پوری مسلم دنیا میں مولانا واحد شخص تھے جنہوں نے اس فتوے کی کھل کر مخالفت کی، اور اسے غیر اسلامی قرار دیا۔ یہ بات سن کر شیو کمار صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ گفتگو کے

دوران وہ نہایت انکساری اور کشادہ ذہنی کے ساتھ ہماری باتیں سن رہے تھے۔ امید ہے کہ اس ملاقات کے بعد Blasphemy کے بارے میں اسلام کا درست موقف ان پر واضح ہو گیا ہو گا۔

بات چیت کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں؟ تو انھوں نے نہایت شائستگی کے ساتھ نفی میں جواب دیا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کہا: ”دنیا میں اتنے مصائب اور مسائل ہیں، لیکن ان سب کے درمیان ہمیں کہیں خدا کا وجود نظر نہیں آیا۔“ انھوں نے مزید کہا: ”میں نے کبھی اپنے عقیدے کو کسی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ ہی اسے کسی بحث ومباحثے کا موضوع بنایا ہے۔“

ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ ضرور God Arises کا مطالعہ کریں۔ یہ ملاقات تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ ہم پُرامید ہیں کہ وہ ان کتابوں کو پڑھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

● بنگلور ٹیم کی جانب سے ”مسلم معاشروں میں امن کا فروغ“ کے عنوان سے مسلم انتظامیہ کے تحت چل رہے اسکولوں اور کالجوں میں ورکشاپس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 5 فروری 2025 کو ٹیم کی چار خواتین، مز تزئین، مز آمنہ، مز عائشہ اور مز قدسیہ نے بنگلور کے مناہل اسکول میں ایک ورکشاپ منعقد کیا۔ اس ورکشاپ میں انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے تعمیری خیالات پیش کیے اور یہ واضح کیا کہ اسلام نے سماجی امن پر کس قدر زور دیا ہے۔ ورکشاپ سے قبل اسکول کی پرنسپل اور اساتذہ سے ملاقات کی گئی، جس میں انھیں سی پی ایس انٹرنیشنل کے سرگرمیوں سے متعارف کروایا گیا۔ تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد، انھوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنے اسکول میں اس ورکشاپ کے انعقاد کی اجازت دی۔ پروگرام میں شریک طلبہ نے اپنے تاثرات میں کہا کہ اس ورکشاپ سے انھیں بہت سی نئی اور قابلِ عمل باتیں سیکھنے کو ملیں، اور ان کے ذہنوں میں موجود کئی الجھنیں دور ہو گئیں۔ (مز فاطمہ سارہ، بنگلور)

● بنگلور سے مولانا وحید الدین خان صاحب کے مضامین پر مشتمل انگریزی میگزین اسپرٹ آف اسلام شائع ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد جناب وشوموہن صاحب نے ہمارے واٹس ایپ پر اپنے تاثرات کچھ یوں بیان کیے: ”یہ میگزین نہایت عمدہ ہے۔ عام لوگ اسلام کی بہت سی مثبت باتوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ اسلام کی نمائندگی ایسے افراد کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو ان تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کریں۔“

● Soulveda ایک روحانیت پر مبنی ڈیجیٹل پلیٹ فارم ہے، جس کا مقصد تحریر کے ذریعے فرد اور سماج کی فلاح و بہبود کو سیکولر سطح پر فروغ دینا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے انگریزی اور ہندی مضامین اس ویب سائٹ پر باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

انگریزی مضامین کے مطالعہ کے لیے یہ QR کوڈ اسکین کریں ☜

ہندی مضامین کے مطالعہ کے لیے یہ QR کوڈ اسکین کریں ☜

शुक्र की अहमियत

कुरआन की पहली आयत है: "सारी तारीफ़ें अल्लाह के लिए हैं, जो तमाम जहानों का पालनहार है" (अल-फ़ातिहा, 1:1)। इस आयत से शुक्र की अहमियत पता चलती है। वास्तव में, इस्लाम के सभी कार्यों में शुक्र ही एक ऐसा कार्य है जिसे इंसान अपनी क्षमता के अनुसार सबसे ऊँचे दर्जे में कर सकता है। अन्य कार्यों जैसे इबादत, अखलाक़ और लेन-देन में कुछ न कुछ कमी रह सकती है, लेकिन शुक्र दिल और दिमाग से जुड़ा हुआ है, और दिल व दिमाग से जुड़े हुए कार्यों में यह संभव है कि इंसान उसे पूर्ण रूप में अदा कर सके। यहाँ वह अपने सारे जज़्बात और अपनी सारी सोच को ख़ुदा के सामने पेश कर सकता है। यह विशेषता केवल शुक्र को हासिल है।

शुक्र क्या है? शुक्र असल में एतराफ़ (स्वीकृति) का दूसरा नाम है। इंसानी मामलों में जिसे एतराफ़ कहते हैं, वही ख़ुदाई मामले में शुक्र है। हर इंसान के लिए यह ज़रूरी है कि वह अपने शऊर (conscious) को इतना ज़्यादा जागृत करे कि उसे मिलने वाली हर चीज़ सही मायनों में ख़ुदा की कृपा दिखाई दे। वह पूर्ण एतराफ़ के जज़्बे के साथ यह कह सके, “ऐ ख़ुदा, तेरा शुक्र है।” ख़ुदा की नेमतों और रहमतों का पूर्ण एहसास करके यह कहना कि "सारी तारीफ़ें अल्लाह के लिए हैं जो तमाम जहानों का पालनहार है" यही शुक्र है और यह शुक्र निस्संदेह सबसे बड़ी इबादत है।

मौजूदा दुनिया में वह चीज़ बहुत बड़े पैमाने पर मौजूद है जिसे लाइफ़ सपोर्ट सिस्टम कहा जाता है। यहाँ की हर चीज़ इस तरह बनाई गई है कि वह इंसान के लिए पूरी तरह अनुकूल हो। ऐसी स्थिति में इंसान को चाहिए कि जब वह इस दुनिया में चले-फिरे और इसका इस्तेमाल करे, तो उसका दिल शुक्र और मानने के एहसास भरा हुआ हो। इस दुनिया की तमाम कीमती चीजें इंसान को बिल्कुल मुफ़्त में मिली हुई हैं, और उनका सच्चा शुक्र ही उनकी क़ीमत है। जो इंसान

इसकी पूरी-पूरी क़ीमत अदा न करे, वह इस दुनिया में एक क़ब्ज़ा करने वाले की तरह है, और ऐसे क़ब्ज़ा करने वाले के लिए सज़ा है, न कि इनाम। शुक्र के एहसास के बिना इस दुनिया में रहना निस्संदेह एक ऐसा गुनाह है जिसे माफ़ नहीं किया जा सकता, चाहे वह औरत हो या मर्द।

हर चीज़ एक इम्तिहान का पेपर है

हदीस में आया है कि अल्लाह के रसूल ने एक सहाबी को नसीहत करते हुए फ़रमाया: "जो तुम्हें मिला, वह तुमसे खोया जाने वाला नहीं था। और जो तुमसे खो गया, वह तुम्हें मिलने वाला ही नहीं था" (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 21611)। इस हदीस से यह समझ में आता है कि इस दुनिया में इंसान को जो कुछ भी मिलता है, वह न तो संयोग से मिलता है और न ही इनाम के रूप में, बल्कि यह सब एक इम्तिहान के पेपर की तरह होता है। ख़ुदा के फ़ैसले के तहत, हर औरत और मर्द को कुछ चीजें दी जाती हैं, ताकि उनमें आज़माकर देखा जाए कि इंसान का रवैया कैसा है। कभी ख़ुदा कोई चीज़ देकर इम्तिहान लेता है कि इंसान ने उस पर शुक्र किया या उसे पाकर घमंड में पड़ गया। इसी तरह कभी कोई चीज़ छीनकर ख़ुदा इंसान का इम्तिहान लेता है कि उससे महरूम होकर उसने सब्र किया या शिकायती ज़ेहन में पड़ गया।

यह ख़ुदा की रचना संबंधी योजना (creation plan of God) है। ऐसी स्थिति में इंसान की नज़र इस पर नहीं होनी चाहिए कि उसने क्या पाया और उससे क्या छीना गया। इसके बजाय उसका सारा ध्यान इस पर होना चाहिए कि जिन हालात में रखकर ख़ुदा ने उसका इम्तिहान लेना चाहा था, उसमें उसने मुनासिब (उपयुक्त) जवाब दिया या वह जवाब देने में नाकाम हो गया।

यह ज़िंदगी का सकारात्मक दृष्टिकोण है। यह ज़िंदगी का सकारात्मक फ़ॉर्मूला है। जिस इंसान में यह मिज़ाज पैदा हो जाए, वह कभी तनाव में नहीं पड़ेगा। वह किसी भी हाल में न मायूस होगा और न ही कड़वाहट में फंसेगा। कोई भी अनुभव

उसे ज़िंदगी की रचनात्मक राह से नहीं भटका सकेगा। वह कभी भी मानसिक या वैचारिक उलझन में नहीं पड़ेगा। उसकी ज़िंदगी में कभी यह घटना नहीं घटेगी कि उसकी ज़िंदगी हालात के भंवर में फंसकर रह जाए और वह अपनी आख़िरी मंज़िल तक न पहुंचे।

विनम्रता - एक महान इबादत

हदीस में आया है: “आदम की हर औलाद गलती करती है, और गलती करने वालों में सबसे अच्छे वो हैं जो तौबा करते हैं ।” (सुनन अल- तिर्मिज़ी, हदीस संख्या 2499)। इसका मतलब है कि हर इंसान गलती कर सकता है, और उनमें से सबसे अच्छा वो है जो गलती के बाद तौबा करता है। अपनी गलतियों को स्वीकारना एक महान इबादत का कार्य है। यह स्वीकारना खुदा के सामने भी होता है और दूसरों के सामने भी। जब कोई अपनी गलती खुदा के सामने स्वीकार करता है, तो उसे तौबा कहा जाता है। और जब यही काम इंसानों के सामने किया जाता है, तो उसे गलती मानना या स्वीकार करना कहा जाता है।

सहाबा की ज़िंदगी का अध्ययन यह बताता है कि वे बहुत अधिक तौबा करने वाले और अपनी गलतियों को मानने वाले थे। कई मौके ऐसे आते हैं जब किसी सहाबी ने कहा कि मुझसे गलती हुई, मुझे माफ़ कर दो, हालाँकि कानूनी दृष्टि से वहाँ कोई गलती नहीं थी।

ऐसा क्यों था? इसका कारण यह है कि यह कहना कि “मैं गलती पर था” दरअसल अपनी विनम्रता को स्थापित करना है। इस्लाम के अनुसार, हर व्यक्ति के पास हर समय खुदा के फरिश्ते मौजूद रहते हैं, जो उसके हर कहे गए शब्द और किए गए कर्मों का रिकॉर्ड रखते हैं। ऐसे में यह स्वाभाविक है कि एक सच्चा ईमानवाला इस बात की इच्छा रखे कि फरिश्ते अपने रिकॉर्ड में उसे एक विनम्र इंसान के रूप में दर्ज करें, न कि एक अभिमानी इंसान के रूप में।

यह भावना एक स्वाभाविक भावना है, जो हर ईमान वाले के अंदर कहीं न कहीं

रहती है। इसी वजह से एक ईमान वाले को यह बिल्कुल पसंद नहीं होता कि वो फरिश्तों की नज़रों में एक अभिमानी इंसान के रूप में नज़र आए। किसी मामले में भले ही उसकी कोई गलती न हो, फिर भी उसकी विनम्र प्रवृत्ति बार-बार यह कहने पर मजबूर कर देती है कि "मैं गलत था।" गलती न मानना अहंकार को संतुष्टि देता है, जबकि गलती को स्वीकार करना एक ईमान वाले की विनम्र प्रवृत्ति को संतोष प्रदान करता है। अहंकार अगर अभिमानी इंसान का भोजन है, तो स्वीकारना एक ऐसे ईमान वाले का भोजन है जो खुदा के सामने पूरी तरह झुका रहता है।

जीवन का कला कौशल

एक सैन्य जनरल ने "युद्ध की कला" (Art of War) के बारे में बताया, कि "सबसे प्रभावी सशस्त्र सेना वह होती है जो क्रोध और नफरत के बिना लड़ाई करती है।"

क्रोध और नफरत के बिना लड़ी जाने वाली लड़ाई अधिक सफल क्यों होती है? इसका कारण यह है कि जब सैनिक क्रोध और नफरत से मुक्त होते हैं, तो वे अधिक अच्छे ढंग से योजना बना सकते हैं। क्रोध और नफरत, व्यक्ति की समझ को प्रभावित करते हैं, जिससे सबसे बेहतर रणनीति अपनाना संभव नहीं होता।

यह सिद्धांत केवल युद्ध की कला का सिद्धांत नहीं है, बल्कि जीवन की कला का भी सिद्धांत है। युद्ध क्षेत्र के बाहर भी लोगों और समूहों के बीच शांतिपूर्ण मुकाबला चलता रहता है। इस शांतिपूर्ण मुकाबले में सफलता के लिए व्यक्ति या समूह को अपने कार्य की सही योजना बनानी होती है। यह सफल योजना वही मन बना सकता है जो क्रोध और नफरत से मुक्त हो, जो निष्पक्ष सोच के आधार पर स्थितियों का आकलन करे, और घटनाओं का नकारात्मक प्रभाव लिए बिना अपनी रणनीति बनाए। ऐसा व्यक्ति मामलों को बेदाग नजरिए से देखता है और अपनी कार्य योजना शुद्ध तथ्यों पर बनाता है। इसी तरह के लोग

अपने विरोधी की स्थिति का सही आकलन कर पाते हैं, और जो ऐसा करते हैं वही सफलता तक पहुँचते हैं।

वास्तव में, *जीवन का कला कौशल* का सिद्धांत भी वही है जो *युद्ध की कला* का सिद्धांत है। दोनों ही में सफलता वे लोग प्राप्त करते हैं जो सकारात्मक दृष्टिकोण से सोचते हैं। इसके विपरीत, जो लोग नकारात्मक सोच रखते हैं, वे हमेशा असफल होते हैं, चाहे वह युद्ध का मैदान हो या शांतिपूर्ण मुकाबले का क्षेत्र।

सफलता का रहस्य

एक इमाम साहब का एक किस्सा है। वे अपनी मस्जिद में जुमे का खुतबा (शुक्रवार का उपदेश) देते थे। खुतबे से पहले वे अक्सर उर्दू में भाषण देते थे, जिसमें वे विवादास्पद मुद्दों पर सख़्त रवैया अपनाते थे। अपनी समझ के अनुसार, वे जिस विचारधारा को सही मानते थे, उसके खिलाफ़ विचारधारा की कड़ी आलोचना करते थे।

इस पर मस्जिद में बड़ी संख्या में नमाज़ियों ने उनके खिलाफ़ आवाज़ उठाई और कहने लगे कि उन्हें इस पद से हटा देना चाहिए। जब मेरी इमाम साहब से मुलाकात हुई, तो बातचीत के दौरान मैंने उनसे पूछा कि आप ऐसी आलोचनात्मक बातें क्यों करते हैं। उन्होंने कहा कि यह तो सच और झूठ का मामला है। यदि मैं इस मामले में न बोलूँ, तो मैं गुनहगार हो जाऊँगा।

मैंने उनसे कहा कि आपकी सोच सही नहीं है। वास्तविकता यह है कि सामूहिक मामलों में अक्सर सही और गलत नहीं देखा जाता, बल्कि यह देखा जाता है कि क्या संभव है और क्या असंभव। पैगंबर मुहम्मद (सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम) की ज़िन्दगी का अध्ययन करने से पता चलता है कि यही आपका तरीका था। मैंने उदाहरण देकर इमाम साहब को समझाया, और उन्होंने मेरी बात मान ली। इसके बाद उन्होंने आलोचनात्मक रवैया छोड़ दिया और अपनी बात को समझदारी के साथ प्रस्तुत करने लगे।

यह जीवन का एक महत्वपूर्ण सिद्धांत है। सामूहिक जीवन में हमेशा समझदारी का महत्व होता है। जो व्यक्ति समझदारी का तरीका नहीं अपनाता, वह केवल समस्याओं को बढ़ाता है, उन्हें हल नहीं कर सकता। जीवन में सच्ची सफलता केवल धैर्य अपनाने वाले को मिलती है। धैर्य का तरीका छोड़ने के बाद किसी को कोई सच्ची सफलता नहीं मिल सकती।

सामूहिक मामलों को हमेशा सही और गलत के दृष्टिकोण से देखना केवल जोश का परिणाम होता है। जिन लोगों के अंदर धैर्य और सहनशीलता होती है, वे मामले पर गंभीरता से विचार करेंगे और फिर वही तरीका अपनाएँगे जो स्थिति की रोशनी में परिणामदायक साबित होने वाला हो।

आत्महत्या: सबसे बड़ा पागलपन

आत्महत्या सबसे बड़ा पागलपन है, क्योंकि यह वह कार्य है जो व्यक्ति तब करता है जब वह सबसे अधिक शक्ति के साथ कुछ करने की स्थिति में होता है। सच्चाई यह है कि आत्महत्या करना किसी भी व्यक्ति के लिए अत्यंत कठिन काम है। सामान्य स्थिति में, कोई भी व्यक्ति खुद को मारने के लिए तैयार नहीं होता। तो फिर कोई आत्महत्या जैसा आखरी कदम क्यों उठाता है? इसका कारण यह है कि जब व्यक्ति को कोई गंभीर झटका लगता है, तो उसका दिमाग फ़ितरी नियमों के तहत संग्रहीत ऊर्जा को छोड़ देता है। इसके नतीजे में उस समय व्यक्ति की शक्ति बढ़ जाती है। यह बढ़ी हुई शक्ति इसलिए होती है कि व्यक्ति आने वाली समस्या का अधिक ताकत के साथ सामना कर सके, लेकिन वह इस ऊर्जा का गलत उपयोग करके आत्महत्या कर लेता है।

यही कारण है कि जो लोग आत्महत्या का प्रयास करते हैं लेकिन किसी कारण से जीवित बच जाते हैं, वे अपनी बाद की जिंदगी में और भी बड़े काम करने में सक्षम हो जाते हैं। आत्महत्या के प्रयास का अनुभव उन्हें जानबूझकर या अनजाने में अपनी छिपी हुई शक्ति से परिचित कराता है। इसलिए, मौत से बचने

की स्थिति में वे इस शक्ति का भरपूर उपयोग करते हैं और अधिक बड़ी सफलताएँ हासिल कर लेते हैं। इस प्राकृतिक सिद्धांत को शेख सादी ने सरलता से इस प्रकार समझाया है:

> "जब बिल्ली असहाय होती है, तो वह अपने नाखून और आँखों को बाघ की तरह दिखा देती है।"

ज़्यादातर इंसानी गलतियाँ इसलिए होती हैं क्योंकि लोग कुदरत के नियमों को नहीं समझते। कुदरत के नियमों के अनुसार, इंसान के दिमाग में हमेशा जमा की हुई ऊर्जा मौजूद रहती है, जो किसी कठिन परिस्थिति के समय अपने आप बाहर निकल जाती है। यह वैसे ही है जैसे नदी में पानी की कमी होने पर बांध को खोलकर अतिरिक्त पानी छोड़ा जाता है। सच्चाई यह है कि यदि मनुष्य प्रकृति के नियमों को समझे, तो वह कई मूर्खताओं और असफलताओं से बच सकता है।

वापसी संभव नहीं होगी

जब मैं आज के लोगों को हंसते और मनोरंजन करते हुए देखता हूँ, तो मुझे एक अजीब सा झटका लगता है। इस गहरे एहसास से मेरे शरीर के रोंगटे खड़े हो जाते हैं। मैं सोचता हूँ कि उनके सामने कैसा अजीब अंत आने वाला है, लेकिन वे इससे अनजान होकर हंस रहे हैं। जल्द ही वे एक भयानक अंत का सामना करने वाले हैं, जिससे वे अपने आप को बचा नहीं सकते, लेकिन उस से पूरी तरह अनजान होने के कारण वे हंस रहे हैं। जबकि उन्हें चुप हो जाना चाहिए और आने वाले भयानक अंत से बचने की योजना बनानी चाहिए।

यह अंत मृत्यु है। हर व्यक्ति जो पैदा हुआ है, उसे किसी न किसी समय मरना है। कोई भी व्यक्ति खुद को मृत्यु से नहीं बचा सकता और न ही उसे यह शक्ति है कि वह खुद को जीवन से वंचित कर सके। जन्म लेने के बाद हर व्यक्ति शाश्वत (eternal) हो चुका है। हर व्यक्ति को हर हाल में जीना है, यहाँ तक कि मृत्यु के बाद भी।

मृत्यु के बाद, हर व्यक्ति अचानक खुद को एक ऐसी दुनिया में पाएगा जहाँ से वापसी संभव नहीं है। इस दूसरी दुनिया में व्यक्ति इस स्थिति में पहुँचेगा कि उसके पास वर्तमान दुनिया में वापस आने के लिए रिटर्न टिकट नहीं होगा—वर्तमान दुनिया कर्म की दुनिया है, यहाँ कोई पुरस्कार नहीं है। अगली दुनिया पुरस्कार की दुनिया होगी, जहाँ किसी के लिए कोई कर्म का अवसर नहीं होगा। यह हर महिला और पुरुष का भाग्य है, कोई भी व्यक्ति अपनी इस तकदीर को बदल नहीं सकता।

वर्तमान दुनिया में रहते हुए हमें सबसे पहले यह जानना चाहिए कि सृजनकर्ता की योजना क्या है। सृजनकर्ता ने यह अद्भुत दुनिया क्यों बनाई और इस में असाधारण क्षमताओं वाले मनुष्य को क्यों बसाया। लोगों की वर्तमान अज्ञानता इस सृजनात्मक योजना को न जानने के कारण है। वे समझते हैं कि उनके सामने कोई और परिणाम आने वाला नहीं है। यदि व्यक्ति यह जान ले कि वह एक लंबे सफ़र पर है, उसे वर्तमान दुनिया से गुजर कर आखिरी दुनिया में प्रवेश करना है, तो उसके जीवन की पूरी रूपरेखा बदल जाएगी।

सोहबत का असर

शेख़ मुसलहुद्दीन सादी शिराज़ी (वफ़ात: 1291 ईस्वी) की मशहूर किताब "गुलिस्तां" में कहानी के अंदाज़ में नैतिक शिक्षा दी गई है। एक कहानी में वे बताते हैं कि वे एक बाग में गए। वहाँ उन्होंने देखा कि एक जगह मिट्टी से खुशबू आ रही है। उन्होंने मिट्टी से पूछा कि यह खुशबू तुम्हारे अंदर कहाँ से आई। मिट्टी ने जवाब दिया:

> "देखो, यहाँ गुलाब का पेड़ उगा हुआ है। इसकी शाखाओं पर खुशबूदार फूल हैं। मैं इन फूलों के पास रहती हूँ, और इन खुशबूदार फूलों ने मुझे भी खुशबूदार बना दिया।"

यह कहानी प्रतीकात्मक रूप में सोहबत (संगति) के प्रभाव को बताती है। यह एक सच्चाई है कि ज़िंदा इंसानों की सोहबत इंसान पर गहरा असर डालती है।

अच्छे लोगों की सोहबत से इंसान अच्छा बनता है और बुरे लोगों की सोहबत से बुरा। इसी वजह से एक फ़ारसी कवि ने कहा:

صحبتِ صالح تُرا صالح کُند

صحبتِ طالح تُرا طالح کند

नेक लोगों का साथ नेक बनता है

बुरे लोगों का साथ बुरा बना देता है

किसी बिगड़े हुए इंसान को सुधारने का एक तरीका यह है कि उसे अच्छे लोगों के बीच उठने-बैठने का मौका दिया जाए। कोई भी इंसान अगर लंबे समय तक अच्छे लोगों की सोहबत में रहे, तो वह ज़रूर उनसे प्रभावित होगा। यह एक नैतिक और स्वाभाविक कानून है, जिसमें मुश्किल से ही कोई अपवाद मिलेगा।

हालाँकि, सोहबत को उपयोगी बनाने के लिए एक ज़रूरी शर्त है, और वह है सब्र (धैर्य)। जब भी ऐसा हो कि किसी बुरे इंसान को अच्छे लोगों की सोहबत में लाया जाए, तो अच्छे लोगों को चाहिए कि वे उसके मामले में सब्र से काम लें। वे पहले ही दिन उससे सुधार की उम्मीद न रखें। वे सुधार और परिवर्तन के लिए इंतजार करें।

उन्हें यह बात समझनी चाहिए कि यह अचानक बदलाव का मामला नहीं है, बल्कि धीरे-धीरे बदलाव का मामला है। हर इंसान की इस्लाह (सुधार) मुमकिन है, बशर्ते सुधार करने वाला धैर्यपूर्वक इंतजार कर सके।

एक कठिनाई, दो आसानियाँ

क़ुरआन की सूरह 94 में फितरत (प्रकृति) के एक सिद्धांत को इन शब्दों में बताया गया है:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

"निःसंदेह, कठिनाई के साथ आसानी है। निःसंदेह, कठिनाई के साथ आसानी है।" (अल-इंशिराह: 5-6)

एक रिवायत (परंपरा) के अनुसार, रसूल अल्लाह (सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम) ने इस आयत की व्याख्या इन शब्दों में की:

لَن يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ، لَن يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ

"एक कठिनाई दो आसानियों पर हावी नहीं हो सकती। एक कठिनाई दो आसानियों पर हावी नहीं हो सकती।" (मुवत्ता इमाम मालिक, हदीस संख्या 1621)

इस व्याख्या की और अधिक स्पष्टता हज़रत अब्दुल्लाह इब्ने अब्बास के एक कथन से होती है। उन्होंने कहा:

يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: خَلَقْتُ عُسْرًا وَاحِدًا، وَخَلَقْتُ يُسْرَيْنِ، وَلَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ

"अल्लाह ने फरमाया कि मैंने एक कठिनाई पैदा की और दो आसानियाँ पैदा कीं। और एक कठिनाई दो आसानियों पर कभी हावी नहीं हो सकती।" (तफसीर अल-क़ुर्तुबी, जिल्द 20, पृष्ठ 107)

यह कोई रहस्यमय बात नहीं, बल्कि एक ज्ञात वास्तविकता है जिसे मानव प्रकृति के अध्ययन से समझा जा सकता है। मनोविज्ञान के अनुसार, जब इंसान किसी कठिनाई का सामना करता है और हिम्मत नहीं हारता, तो उसके अंदर दोगुनी ताकत आ जाती है। एक ताकत वह जो सामान्य स्थिति में पहले से मौजूद थी, और दूसरी ताकत वह जो बढ़ी हुई प्रेरणा (incentive) की वजह से उसके अंदर आती है।

इस प्रकार, कठिनाई आने पर इंसान अपने अंदर बढ़ी हुई प्रेरणा के कारण अधिक दृढ़ता और हिम्मत के साथ कठिनाई का सामना करने में सक्षम हो जाता है।

इंसान को चाहिए कि वह मानव प्रकृति के इस रहस्य को समझे और कठिनाई आने पर खुद को संयमित रखे। ऐसा करने से वह प्रकृति को यह अवसर देगा कि वह उसकी ताकत को दोगुना कर सके और उसकी सफलता सुनिश्चित कर सके। कठिनाई प्रकृति के नियम का हिस्सा है। इसी तरह यह भी प्रकृति का हिस्सा है

कि जब इंसान पर कोई कठिनाई आए, तो वह दोगुनी ताकत के साथ उसका सामना करने के योग्य हो जाए।

अक्लमंद इंसान

जैसा कि मालूम है, हज़रत आदम पहले इंसान थे। उनके दो बेटों, क़ाबील और हाबील के बीच एक मामले में झगड़ा हुआ। यहां तक कि बड़े बेटे क़ाबील ने छोटे बेटे हाबील से कहा, "मैं तुम्हें मार डालूंगा।" हाबील ने जवाब दिया, "अगर तुम मुझे क़त्ल करने के लिए हाथ उठाओगे तो मैं तुम्हें क़त्ल करने के लिए तुम पर हाथ नहीं उठाऊंगा।" (सूरह माइदा, 5:28)

रसूल अल्लाह ﷺ ने एक मौके पर अपने साथियों को नसीहत करते हुए फरमाया:

> "मेरे बाद तुम लड़ाई-झगड़े की सियासत से पूरी तरह परहेज करना। और अगर विवाद तुम्हारे सिर तक पहुंच जाए, तो तुम आदम के दो बेटों में से बेहतर बेटे की तरह बन जाना।" (सुनन अबू दाऊद, हदीस संख्या 4259)

यह पैग़ंबरी नसीहत सिर्फ राजनीतिक टकराव के लिए नहीं, बल्कि आम जिंदगी के हर पहलू से संबंधित है। मिसाल के तौर पर, मान लीजिए आपके पास एक कर्मचारी है, जो बहुत मेहनती और ईमानदार है। ऐसा कर्मचारी अक्सर अपनी पहचान और सम्मान के मामले में संवेदनशील होता है। यदि आप उसकी किसी गलती पर कठोर टिप्पणी करें, तो संभव है कि वह गुस्से में आ जाए। उसे यह महसूस हो सकता है कि वह इतनी निष्ठा से काम कर रहा है, और इसके बावजूद उसे डांटा जा रहा है। इसका परिणाम यह हो सकता है कि आप उस महत्वपूर्ण कर्मचारी को खो दें।

इस समस्या के समाधान में दो पक्ष शामिल हैं— आप और आपका कर्मचारी। समस्या का हल यह है कि दोनों में से कोई एक अक्लमंदी दिखाए। या तो आपका कर्मचारी आपकी डांट को नजरअंदाज कर दे और उसे दिल पर न ले, या आप खुद अक्लमंदी का सबूत दें और उसके नकारात्मक प्रतिक्रिया को गंभीरता से न

लें। अगर दोनों में से कोई भी अक्लमंदी न दिखाए, तो इसका परिणाम निश्चित रूप से बर्बादी की शक्ल में सामने आएगा।

इसी तरह, मान लीजिए आप बहुत बुद्धिमान हैं और दूसरों की कमजोरियों को तुरंत समझ जाते हैं। ऐसी स्थिति में, यदि आप किसी की कमजोरी देखें, तो स्वाभाविक रूप से आप इस पर तीव्र प्रतिक्रिया देंगे। आम अनुभव के आधार पर कहा जा सकता है कि दूसरा व्यक्ति आपकी प्रतिक्रिया पर नाराज़ हो सकता है।

यह स्थिति दोनों के लिए अक्लमंदी का इम्तिहान है। यदि दूसरा व्यक्ति अक्लमंदी दिखाए और अपनी नाराज़गी को प्रकट न करे, तो यह उसके लिए अक्लमंदी की बात होगी। लेकिन यदि दूसरा व्यक्ति ऐसा न कर सके, तो इस मौके पर आपको अक्लमंद बनना होगा, यानी आप उसकी नाराज़गी को नज़रअंदाज़ कर दें। अगर दोनों में से कोई भी अक्लमंदी न दिखा सके, तो इसका परिणाम निश्चित रूप से विनाशकारी होगा।

आपसी रिश्तों में सफलता के लिए यह एक अत्यंत महत्वपूर्ण सिद्धांत है। यह सिद्धांत पारिवारिक जीवन, सामाजिक जीवन और व्यापक अर्थों में राष्ट्रीय जीवन से भी संबंधित है। इस सिद्धांत को न अपनाने के कारण परिवारों में झगड़े पैदा होते हैं, पति और पत्नी में तलाक होता है, संस्थानों और संगठनों में टकराव होता है, और राष्ट्रों के बीच युद्ध होते हैं।

मिलती-जुलती दुनिया

क़ुरआन में बताया गया है कि जन्नत में जब अहल-ए-जन्नत को वहाँ का रिज़्क दिया जाएगा, तो वे कहेंगे— "यह वही है जो हमें दुनिया में दिया गया था।" और उन्हें वहाँ मिलता-जुलता (मुतशाबेह) रिज़्क दिया जाएगा (2:25)।

असल में अल्लाह ने दो दुनियाएँ एक-दूसरे से मिलती-जुलती बनाई हैं। एक मौजूदा दुनिया, और दूसरी जन्नत की दुनिया। मौजूदा दुनिया एक परीक्षा के लिए

है, जबकि अगली दुनिया परिणाम के लिए। मौजूदा दुनिया अधूरी है और आख़िरत की दुनिया पूरी। यह अपूर्ण है और वह पूर्ण। क़ुरआन के शब्दों में, यहाँ भय और दुख है, जबकि अगली दुनिया भय और दुख से पूरी तरह मुक्त है (2:62)।

मौजूदा दुनिया में व्यक्ति बार-बार यह अनुभव करता है कि जो कुछ वह चाहता है, वह यहाँ मौजूद है, लेकिन इसके बावजूद उसे पूरा प्राप्त नहीं हो पाता। व्यक्ति स्वास्थ्य चाहता है, लेकिन बीमारी, दुर्घटना, और बुढ़ापा उसकी इच्छाओं को नकार देते हैं। व्यक्ति आनंद चाहता है, लेकिन कई प्रयासों के बाद भी जब वह इसे प्राप्त करता है तो उसे पता चलता है कि वह इससे संपूर्ण आनंद नहीं पा सकता। वह ख़ुशियों से भरी हुई ज़िंदगी चाहता है, लेकिन ख़ुशियों के बाग में दाख़िल होकर पाता है कि यह बाग काँटों से भरा हुआ है।

ऐसा इसलिए है क्योंकि इंसान को यहाँ जन्नत का केवल दूर से परिचय दिया जाता है। यहाँ उसे जन्नत की झलक तो दी जाती है, लेकिन यह भी बताया जाता है कि यह उसे इस दुनिया में नहीं मिल सकती। यहाँ उसे जन्नत के लिए प्रयास करने के लिए कहा गया है, ताकि अगले जीवन में उसे जन्नत प्राप्त हो सके। इस दुनिया में उससे कर्म की अपेक्षा की गई है, और इसी के साथ उसे यह भी दिखाया गया है कि यदि उसने कर्म में सफलता पाई, तो वह किस दुनिया में प्रवेश करेगा। मौजूदा दुनिया जन्नत का परिचय है, और अगली दुनिया जन्नत की प्राप्ति का स्थान।

मेहमान-नवाज़ी या दिखावा

आजकल यह आम प्रचलन है कि लोग अपने मेहमानों के खाने-पीने का बहुत ज़्यादा इंतज़ाम करते हैं और इस पर काफी पैसा खर्च करते हैं। अगर उनसे कहा जाए कि यह फ़िज़ूलखर्ची और संसाधनों को व्यर्थ करना है, तो वे कहते हैं कि यह शरियत की शिक्षा है, क्योंकि इस्लाम में "इकराम-ए-ज़ैफ़" (मेहमान का सम्मान) का आदेश है।

मगर यह पूरी तरह से ग़लतफहमी है। शरियत में जिस इकराम-ए-ज़ैफ़ का आदेश है, वह केवल आवश्यकता के अनुसार है, न कि दिखावे और तकल्लुफ़ के लिए। हदीस में इकराम-ए-ज़ैफ़ की शिक्षा दी गई है। हदीस में है कि हज़रत मुहम्मद (स.अ.व.) ने फ़रमाया, "जो ईश्वर पर और आख़िरत के दिन पर विश्वास रखता हो, उसे चाहिए कि अपने मेहमान का इकराम करे।" मगर इकराम का अर्थ हरगिज़ तकल्लुफ़ (दिखावा) नहीं। यह एक मानवीय और नैतिक कार्य है, न कि कोई दिखावे की चीज़।

मेहमान के लिए तकल्लुफ़ से बचने की सख़्त हिदायत दी गई है। हज़रत सलमान (रज़ि.) ने बताया, "पैग़म्बर मुहम्मद (स.अ.व.) ने हमें मेहमान के लिए तकल्लुफ़ करने से मना किया।" (शु'ब-उल-ईमान 9155) इसी तरह, एक हदीस में पैग़म्बर मुहम्मद (स.अ.व.) ने फ़रमाया, "मैं और मेरी उम्मत के परहेज़गार लोग तकल्लुफ़ से बहुत दूर रहते हैं।" (अल-मक़ासिदुल हसनः, 191)

वास्तव में, मेहमान की खातिरदारी में जो तकल्लुफ़ किया जाता है, वह असल में मेज़बान के खुद के सम्मान का एक रूप होता है, न कि मेहमान का सम्मान। एक परहेज़गार व्यक्ति के लिए तकल्लुफ़ जैसी दिखावटी चीज़ का कोई महत्व नहीं होता।

सच्चा अमल, सच्ची दुआ

हर इंसान जो इस दुनिया में आता है, एक निश्चित समय के बाद उसे मरना है और अल्लाह के सामने पेश होना है। इसके बाद अल्लाह उसकी हमेशा की ज़िंदगी के बारे में फ़ैसला करेगा। यह हमेशा की ज़िंदगी या तो जन्नत के रूप में होगी या जहन्नम के रूप में। इसे "नजात" (मुक्ति) कहते हैं।

यह नजात उन लोगों को मिलेगी जो अल्लाह के सामने इस हाल में हाज़िर हों कि उनके पास दो में से एक चीज़ अपनी बेहतरीन सूरत में मौजूद हो—सच्चा

अमल या सच्ची दुआ। सच्चा अमल वह है जो केवल अल्लाह की रज़ा के लिए किया जाए, और सच्ची दुआ वह है जो पूर्ण असहायता की भावना के साथ की जाए।

सच्चे अमल का मापदंड यह है कि उसे पूरी तरह अल्लाह की खातिर किया जाए। और सच्ची दुआ का मापदंड यह है कि उसे सम्पूर्ण असहायता की स्थिति में किया जाए।

खुदा की तरफ़ से सच्चे अमल की प्रेरणा उसे मिलता है जो अपने अंदर से पूरी तरह से दिखावे और दोगलेपन को निकाल दे, जिसके कथन और कर्म में कोई फर्क न रहे, और जो अपनी कमजोर शख़्सियत को बदल सके। इसी तरह, खुदा की तरफ़ से सच्ची दुआ की प्रेरणा उसे मिलती है जो अपने शुऊर (conscious) को इस स्तर तक बढ़ा ले कि वह अल्लाह की शक्ति के सामने अपनी पूरी असहायता को महसूस कर सके। इस स्तर पर पहुँच कर ही किसी को सच्ची दुआ हासिल होती है।

वास्तव में सच्ची दुआ और सच्चा अमल अलग नहीं हैं। सच्ची दुआ में सच्चा अमल शामिल होता है, और सच्चा अमल हमेशा सच्ची दुआ की बुनियाद पर ही पैदा होता है। मनोवैज्ञानिक दृष्टि से, सच्चे अमल और सच्ची दुआ को अलग नहीं किया जा सकता। सच्चा अमल वास्तव में "हक़ीक़ी अमल" का दूसरा नाम है, और सच्ची दुआ "हक़ीक़ी दुआ" का दूसरा नाम।

शादाबी लौट आई

दिल्ली में मेरी रहने की जगह के पास एक पेड़ है, जिसे मैं "स्पिरिचुअल ट्री" (आध्यात्मिक पेड़) कहता हूँ। इसके नीचे बैठकर मुझे शांति मिलती है।

मानसून से पहले यह पेड़ सूख गया था। बेजान तने की तरह लग रहा था, और मैंने सोचा कि शायद इसकी उम्र पूरी हो चुकी है और यह दोबारा हरा नहीं होगा।

लेकिन मानसून आने के बाद इसमें फिर से हरियाली लौटने लगी। इसकी शाखाओं पर हरी पत्तियाँ निकलने लगीं, और अगस्त के अंत तक यह पूरी तरह से हरा-भरा हो गया।

यह एक प्रतीकात्मक रूप में इंसान के लिए एक सबक है। इंसान के शारीरिक जीवन के लिए भी यह ज़रूरी है कि उसे "पानी" मिलता रहे। जिस इंसान को इस पानी से वंचित कर दिया जाए, उसकी शख्सियत भी सूखे पेड़ जैसी हो जाएगी।

इंसानी जीवन के लिए यह जीवनदायी पानी अल्लाह की रहमत है। इंसान को चाहिए कि वह अल्लाह के साथ निरंतर आध्यात्मिक संबंध बनाए रखे। इसी संबंध से उसे जीवन्तता मिलेगी। अगर यह संबंध किसी कारणवश टूट जाए तो उसकी हालत सूखे पेड़ की तरह हो जाएगी।

अल्लाह से इस संबंध का माध्यम "ज़िक्र" (स्मरण) है। यह किसी विशेष दुआ का नाम नहीं है बल्कि यह अलग-अलग स्थितियों में उसे बार-बार याद करना है। जैसे इस पेड़ को देख कर हमने अल्लाह के चमत्कार को देखा और दिल से दुआ की: "हे अल्लाह, जिस तरह इस पेड़ को हरा किया है, वैसे ही मुझे भी जीवन्तता से भर दे।" ऐसी सोच के साथ जीने वाला इंसान हर चीज़ में अल्लाह के काम की झलक पाता है। वही समझदार है जो इस रब्बानी फैज़ (रहमत) को अपनी ज़िंदगी में अपनाता है।

क्रोध को त्याग दो

हज़रात अबू हुरैरा कहते हैं कि अल्लाह के रसूल की ख़िदमत में एक व्यक्ति आया और बोलाः मुझे उपदेश दीजिए। आपने फ़रमाया: “क्रोध को त्याग दे।” उसने दोबारा कहाः मुझे उपदेश दीजिए। आपने फिर फ़रमाया: “क्रोध को त्याग दे।” वह बार-बार अपना सवाल दोहराता रहा और आप बार-बार यही कहते रहे: “क्रोध को त्याग दे।” (सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 6116)

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

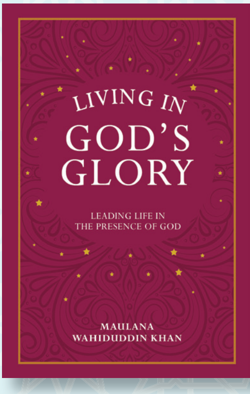

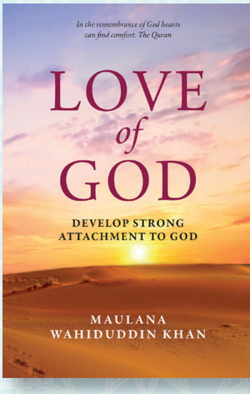

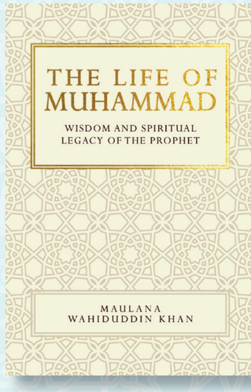

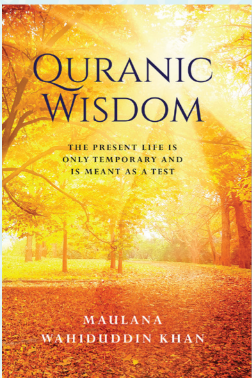

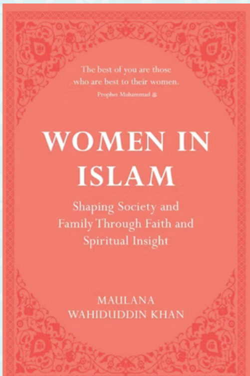

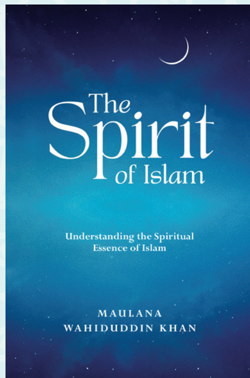

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23